مغربی مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ کی زہر میں ڈوبی ہوئی تحریر پر بے لاگ تبصرہ

پیغمبر انسانیت



مصنف

مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی

ابن علامہ ارشد القادری

تقدیم

مفکر اسلام علامہ قمر الزمان اعظمی

سیکریٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن مانچسٹر یوکے

والضحیٰ پبلی کیشنز

مغربی مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ کی زہر میں ڈوبی ہوئی تحریر پر بے لاگ تبصرہ

پیغمبر انسانیت

مصنف

مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی

ابن علامہ ارشد القادری

تقدیم

مفکر اسلام علامہ قمر الزمان اعظمی

سیکریٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن، مانچسٹر، یو کے

والضحیٰ پبلی کیشنز

داتا دربار مارکیٹ لاہور۔ پاکستان

0300-7259263,0315-4959263

کتاب	پیغمبرِ انسانیت
مصنف	مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی
حسب ارتضا	محمد رضاء الحسن قادری؛ مؤسس دار الاسلام، لاہور
ناشر	**والضحیٰ** پبلی کیشنز، دربار مارکیٹ، لاہور، پاکستان
لیگل ایڈوائزر	محمد صدیق الحسنات ڈوگر؛ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ
تاریخ اشاعت	ربیع الاول 1435ھ/جنوری 2014ء
تعداد	1100
قیمت	

ملنے کے پتے

مکتبہ فیضانِ مدینہ؛ مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد 0346-6021452، 0312-6561574

مکتبہ نوریہ رضویہ پبلی کیشنز؛ فیصل آباد، لاہور	**دار الاسلام**؛ داتا دربار مارکیٹ، لاہور
مکتبہ صدر الشریعہ؛ دربار مارکیٹ، لاہور	انوار الاسلام؛ چشتیاں، بہاول نگر
مکتبہ غوثیہ ہول سیل؛ کراچی	رضا بک شاپ؛ گجرات
اسلامک بک کارپوریشن؛ راول پنڈی	مکتبہ شمس وقمر؛ بھاٹی چوک، لاہور
مکتبہ قادریہ؛ لاہور، گجرات، کراچی، گوجرانوالہ	مکتبہ اہل سنت؛ فیصل آباد، لاہور
مکتبہ امام احمد رضا؛ لاہور، راول پنڈی	دار النور؛ داتا دربار مارکیٹ، لاہور
ہجویری بک شاپ؛ گنج بخش روڈ، لاہور	ضیاء القرآن پبلی کیشنز؛ لاہور، کراچی
احمد بک کارپوریشن؛ راول پنڈی	مکتبہ برکات المدینہ؛ کراچی
مکتبہ درسِ نظامی؛ پاک پتن شریف	علامہ فضل حق پبلی کیشنز؛ لاہور

شرف انتساب

والدِ گرامی قائدِ اہلِ سنت

علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جن کے اچھوتے اسلوب تحریر سے

تنقید و تبصرے کا شعور بیدار ہوا

غلام زرقانی

ایک نظر میں

نام: غلام زرقانی

قلمی نام: نامؔی دہلوی

پیدائش: جمشید پور، ۴؍جنوری ۱۹۶۸ء

والدگرامی: قائدِاہلِ سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ و الرضوان

تعلیم: انٹر میڈیٹ آف سائنس کریم سٹی کالج، جمشید پور

بی۔اے (اردو) رانچی یونی ورسٹی

درس نظامی دارالعلوم فیض الرسول، براؤں شریف

بی۔اے (اسلامیات) کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ، لیبیا

دراساتِ علیا (علوم قرآن) کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ، لیبیا

ایم۔اے (عربی ادب) جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

پی۔ایچ۔ڈی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

انفارمیشن ٹکنولوجی بی۔سی۔آئی، ہیوسٹن

ذمہ داریاں: بانی وچیئرمین حجاز فاؤنڈیشن آف امریکہ، ہیوسٹن، امریکہ

صدر و مہتمم	مدرسہ فیض العلوم، جمشید پور، انڈیا
امیر جامعہ	جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، دہلی
سربراہِ اعلیٰ	مرکزی ادارہ شرعیہ، پٹنہ
مہتمم	اسلامی مرکز، رانچی
سرپرست	ضیاء الاسلام کولکاتا
سربراہِ اعلیٰ	جیلانی ایجوکیشنل ٹرسٹ، بلیا
صدر	تنظیم اہل سنت، جمشید پور
جنرل سکریٹری	رویت ہلال کمیٹی آف نارتھ امریکہ، امریکہ
مہتمم	باری مسجد، جمشید پور

مصروفیات:

خطابت	جامع مکہ مسجد، ہیوسٹن، امریکہ
اسسٹنٹ پروفیسر	لون اسٹار کالج، ہیوسٹن، امریکہ
کالم نگاری	روزنامہ ''انقلاب'' دہلی وغیرہ
تدریس	حجاز انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ہیوسٹن
مدیر اعلیٰ	سہ ماہی ''آیات'' امریکہ و ہند سے نکلنے والا جریدہ

مشاغل : درس و تدریس، تصنیف و تالیف، خطابت، شعر و شاعری، ملی خدمات

قلمی خدمات: تقریباً پچاس سے زائد مقالات و مضامین اور تبصرے جو ہندوستان، امریکہ اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

تصانیف

۱- فیضان القرآن (دل کش اُسلوب میں قرآنِ کریم کا ترجمہ بیانیہ)

۲ مساهمة غلام علی آزاد بلکرامی و اثرائه فی اللغة العربیة و آدابها (عربی)

3. Islamic Supplicatrion (Engllish)

4. Essence of the Quran (English)

5. Prophets in the Quran (English)

6. Message of the Quran (English)

7. Message of the Hadith (English)

8. Fundamental Islamic Beliefs (English)

9. Authentic Way of Prayer (English)

10. Authentic Way of Fasting & Zakat (English)

11. Authentic Way of Hajj & Umrah (English)

12. Authentic Way of Marriage & Divorce (English)

13. Authentically Recognized Halal & Haram (Engiish)

۱۴- حدیثِ دل (نعتیہ مجموعہ)

۱۵- علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ اور دعوتِ اسلامی

۱۶- فکر و نظر کے دریچے

۱۷- پیغمبرِ انسانیت (مغربی مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب پر تنقید)

ترتیب، تخریج اور تقدیم

۱۸- تجلیاتِ رضا: علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

۱۹- خطباتِ استقبالیہ: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۰- فقہ، حدیث اور جہاد کی شرعی حیثیت: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۱- عینی مشاہدات: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۲- اظہارِ عقیدت: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۳- بزبانِ حکایت: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

۲۴- شخصیات: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

زیر ترتیب

۱- الامن و العلی کی تلخیص و تسہیل: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (مع اضافہ و تکمیل)

۲- تفسیر اُمّ القرآن: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (مع اِضافہ و تکمیل)

۳- صدائے قلم: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (خطوط کا مجموعہ)

۴- افکار و نظریات: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (مقالات کا مجموعہ)

۵- مطالعہ دیو بندیت: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (مع اضافہ و تکمیل)

۶- علم و آگہی: علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ (ملی مسائل پر بے لاگ تبصروں کا مجموعہ)

زیر تصنیف

۷- حرفِ حکایت (سبق آموز واقعات)

۸- تفہیم خیالات (مقالات کا مجموعہ)

۹- فیضان القرآن (قرآن کریم کا ترجمہ بیانیہ ایک اچھوتے اسلوب میں)

۱۰- ضربِ قلم (اسلامیات پر مغربی مفکرین کے اعتراضات کا تعاقب)

۱۱- ***Days of the Prophet*** (انگریزی میں)

۱۲- سوزِ دل (نعتیہ کلام کا دوسرا مجموعہ)

مشمولات

آغازیہ

میرے ایک دوست نے کیرن آرمسٹرانگ کی لکھی ہوئی کتاب بہ نام ''محمد ہمارے عہد کے پیغمبر'' کی پذیرائی کچھ اس انداز سے کی کہ میں نے ان کے دولت خانے سے رخصت ہوتے ہوئے کچھ دنوں کے لیے وہ کتاب مانگ لی۔ اپنی عدیم الفرصت زندگی سے چند ساعات نکال کر جب اسے پڑھنا شروع کیا، تو حیرت و استعجاب سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور میں سکتے میں آ گیا۔ کوئی شک نہیں کہ کتاب کی پشت پر لکھے ہوئے تعارفی کلمات ایسے پرکشش اور جاذب نظر ہیں کہ پڑھتے ہی دل کھنچا چلا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ مصنفہ کے قلم سے کوئی عقیدت کیش مصطفےٰ جان رحمت ﷺ کی چوکھٹ پر دست بستہ اپنے دلی جذبات کی نذریں پیش کر رہا ہے، لیکن جب بین السطور سے پھوٹنے والی زہریلی کرنوں کا سراغ لگایئے، تو یقین ہو جاتا ہے کہ بہ ظاہر دکھائی دینے والی بہاریں کسی خطرناک طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ انہوں نے مستحکم بنیادیں کم زور کرتے ہوئے خوب صورت عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالات و واقعات پر نگاہ رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی عمارت عارضی طور پر کچھ دنوں کے لیے بھلی ضرور دکھائی دے گی، لیکن بنیاد کی کم زوری جلد ہی اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی۔ اس حوالے سے صرف ایک مثال سماعت کرتے چلیے!

"He had been certain that he had been sent

simply as a 'warner' to his own tribe and that Islam was only for the people of Mecca. But now he was beginning to look further afield to the People of the Book, who had recived earlier revelations."(۱)

''آپ (ﷺ) کو قطعی یقین تھا کہ وہ صرف اپنے قبیلے کے لیے نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اسلام صرف اہل مکہ کے لیے ہے۔ لیکن اب وہ اہل کتاب کے علاقے کی طرف دیکھنے لگے جنھیں پہلے وحی کی جاچکی تھی۔''

ذرا توجہ فرمائیے کہ مصنفہ کہنا یہ چاہتی ہیں کہ ابتدائی طور پر رسول اکرم ﷺ کو یقین تھا کہ وہ صرف اہل مکہ کے لیے ہی رسول بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں، لیکن طائف سے واپسی پر گروہ جن کے ذریعہ قرآن کریم کی پذیرائی سے محسوس ہونے لگا کہ وہ صرف اہل مکہ کے لیے نہیں ہیں۔ اور یہی وسعتِ فکران کے مدینے کی طرف دیکھنے کا سبب بن گئی۔ اس میں شک نہیں کہ موہوم خیالات پر رسالت عامہ کی بنیاد رکھ کر مصنفہ نے اسلام کے ثابت شدہ عقیدہ عموم نبوت پر نقب زنی کی کوشش کی ہے۔

ایک دوسرے مقام پر انھوں نے پیغامِ اسلام کے آجانے کے بعد بھی یہودیت و نصرانیت کے برحق ہونے پر قرآنِ کریم سے اِستدلال کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

"Muhammad would not have expected the Jews to convert to his religion, because they had their own revealed din. God had decreed that each community should have its own

---

۱- نفس کتاب، ص: ۹۳

messenger."(۱)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہودیوں سے امید نہیں رکھتے تھے کہ وہ اسلام قبول کریں گے، کیوں کہ ان کے لیے خود ان کا اپنا ایک الہامی مذہب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فیصلہ فرمادیا تھا کہ ہر قوم کے لیے ان کا ایک اپنا نبی ہے۔''

اگر مصنفہ نے اپنی پیش کش کے لیے عدل وانصاف، حق و برتری اور غیر جانب دارانہ پالیسی کے خوب صورت غلاف کا اِستحصال نہ کیا ہوتا، تو شاید مجھے قلم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑتی، لیکن جب مَیں نے محسوس کیا کہ ''بہ ظاہر پرکشش'' دکھائی دینے والی کتاب اپنوں کو مغالطے میں ڈال سکتی ہے، تو مَیں نے اپنی بساط بھر کتاب کے بعض اہم مشتملات پر نوٹ لکھ کر ہندوشمالی امریکہ سے بہ یک وقت شائع ہونے والے سہ ماہی ''آیات'' کے حوالے کردیے۔ ابتدا میں خیال تھا کہ ایک دوقسطوں میں بات مکمل ہوجائے گی، لیکن پہلی ہی قسط کے بعد احباب کا اِصرار بڑھا کہ اسے تفصیل کے ساتھ جاری رہنا چاہیے، تاکہ عام قارئین مغربی تصنیفات کے اندر چھپے ہوئے زہریلے مواد کی جھلکیاں دیکھ سکیں۔ اب کیا تھا، دوچار مزید اقساط سہ ماہی کی زینت بن گئے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ رسالہ کے ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر امجد رضا امجد قاضی ادارہ شرعیہ پٹنہ نے فہمائش کردی کہ اسے علاحدہ کتابی شکل دے دی جائے۔ اس لیے یہ کہنا اِعتراف حق شناسی ہے کہ اس کتاب کے منصۂ شہود پر آنے کا سہرا انہیں کے سر بندھتا ہے۔

کتابوں کے مروّجہ طریقہ پیش کش سے انحراف کرتے ہوئے، اسے ابواب اور فصول میں تقسیم نہیں کیا جاسکا ہے کہ نقد وجرح کے تقاضے پوری کتاب میں بے ترتیبی کے ساتھ بھاگنے پر مجبور کرتے رہے۔ بہ ہر کیف، بعض اہم مسائل پر جلی عنوانات

۱۔ نفس کتاب، ص:۱۰۸

ضرور قائم کر دیے گئے ہیں، تا کہ قارئین کو کسی قدر سہولت ہو سکے۔

کتاب کی ابتدا میں کیرن آرمسٹرانگ کے حوالے سے ایک مختصر تعارف بھی پیش کر دیا گیا ہے، تا کہ دنیائے علم و معرفت میں مصنفہ کی موجودہ حیثیت کا اندازہ ہو سکے۔

میں تہ دل سے ترجمانِ اسلام مفکرِ ملت حضرت علامہ قمر الزماں اعظمی جنرل سکریٹری ورلڈ اسلامک مشن لندن کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود میری گزارشات کو شرف قبولیت سے سرفراز فرمایا اور اپنے دعائیہ کلمات میرے سپرد کیے۔ اخیر میں اپنی شریکۂ حیات کے لیے بھی دعا گو ہوں کہ انہوں نے بچوں کی تربیت و نگہداشت کی ذمہ داریوں کے باوجود بڑی توجہ کے ساتھ پروف ریڈنگ کی اور مفید مشورے بھی دیے۔

غلام زرقانی قادری

ہیوسٹن، امریکہ

۲۵ مئی ۲۰۱۳ء

×××

تقدیم

ترجمانِ اِسلام مفکرِ ملت

علامہ قمرالزماں اعظمی

سکریٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن

اِس سال امریکہ کے تبلیغی دورے میں ہیوسٹن ٹیکساس جانے کا موقع ملا اور قائد ملت حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کے قابل فخر فرزند حضرت مولانا غلام زرقانی مدظلہ العالی کی کتاب ''پیغمبر انسانیت'' کے مسودے کے زیارت کی۔ اس چشم کشا و دل کشا کتاب کے مطالعے سے بے پناہ مسرت ہوئی اور یہ یقین پختہ ہوگیا کہ الولد سر لابیہ کے فطری ضابطے کے مطابق مولانا زرقانی اپنے عظیم والد رئیس القلم علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کے سیال اور برق رفتار قلم کے بہترین وارث ہیں۔

مولانا موصوف نے اس کتاب میں برطانیہ کی مشہور مستشرقہ کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب ''محمد ہمارے عہد کے پیغمبر'' کی ملمع کاریوں اور دیسہ کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ خیال رہے کہ اس کتاب کو ایک سازش کے تحت عالمی شہرت دی گئی اور مصنفہ کو بہت سے ایوارڈ سے نوازا گیا اور عالمی سطح پر بہت زیادہ اسے سراہا گیا، ٹھیک اسی طرح سے جیسے ڈاکٹر سر ولیم میور کی کتاب ''دی لائف آف محمد'' کو شہرت

دی گئی تھی۔

اس کتاب میں بھی پیغمبر اسلام علیہ السلام کی سیرت سے متعلق انہیں پرانے اِلزامات کو نئے انداز میں دہرایا گیا ہے، مگر اس انداز میں کہ پڑھنے والا اسے حقیقت جانے اور اس کو سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بہترین تصور کرے۔ اس زہریلی تحریر کو شہد میں ملا کر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری لاشعوری طور پر مستشرقین کے ان تمام اِلزامات کو صحیح تصور کرنے لگے، جو پیغمبر اسلام کی سیرت پر صدیوں سے لگائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ذرا انہیں دیکھیے :

۱- پیغمبر اسلام صرف اپنے قبیلے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے، تاہم بعد میں انہوں نے ان علاقوں میں بھی اسلام کو غالب کرنا چاہا، جو پہلے بھیجے گئے انبیا اور آسمانی کتابوں پر ایمان لا چکے تھے۔

۲- اللہ نے ہر قوم کے لیے نبی بھیجا تھا۔ پیغمبر اسلام اپنی قوم کے نبی تھے، اس لیے انہیں اس بات پر یقین تھا کہ یہودی ان پر ایمان نہ لائیں گے۔

۳- اسلامی قوانین کے دوسرے اہم ماخذ حدیث کے بارے میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ پیغمبر اسلام کے وصال کے سو سالوں کے بعد مسلم دانش وروں نے اسے مدون کیا ہے۔

۴- وحی پاک کے بارے میں مستشرقین کے قدیم اعتراض کو دہرایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام نے وحی کی کیفیت کو آسیب وغیرہ تصور کیا، گویا انہیں اپنے پیغمبر ہونے کا نہ یقین تھا اور نہ ہی وحی پاک کی حقیقت سے آشنائی تھی۔

۵- وحی پاک کے تذکرے کے ساتھ ساتھ عرب شعرا کے آسیب زدہ کلام کا تذکرہ کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ وحی پاک بھی اسی قبیل کی ایک شے تھی۔

۶- پیغمبر اِسلام علیہ السلام کے اُمی ہونے اور و ما انا بقاری سے استدلال کرتے

ہوئے ان کو ان پڑھ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حالاں کہ اُمّی ہونے کا صرف یہ مفہوم ہے کہ انہوں نے کسی انسانی دبستان یا ہیومن ایجنسی سے علم حاصل نہیں کیا ہے، بلکہ ان کا پروردگار ہی ان کا معلم ہے۔ اس حقیقت پر بہت سی آیات مبارکہ دلالت کرتی ہیں۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جس کو انسان پڑھائیں، وہ تو تعلیم یافتہ کہلائے اور جس کو عالم الغیب والشہادۃ نے تعلیم دی ہو، انہیں ان پڑھ کہا جائے۔

۷- پیغمبر اِسلام کو اِعلانِ نبوت سے پہلے معاشرے میں کوئی اِمتیازی حیثیت حاصل نہ تھی۔

۸- پیغمبر اسلام نے اختلافات سے بچنے کے لیے خدا کی توحید پر زور نہیں دیا۔

حالاں کہ قرآن عظیم میں تمام مکی سورتیں توحید، رسالت، آخرت اور وحی پاک کی صداقت وحقیقت ہی کی وضاحت کرتی ہیں۔

۹- تلك الغرانيق العلى کی باطل روایت کو تواتر کے ساتھ کئی سو سال سے مستشرقین دہرا رہے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے مشرکین کو خوش کرنے کے لیے یہ الفاظ ادا کیے یا پھر سورہ والنجم کی تلاوت کے دوران معاذ اللہ شیطان نے ان کی زبان پر جاری کردیے تھے۔ اس جھوٹے واقعے کو اس قدر شہرت دی گئی ہے کہ سلمان رشدی نے اسی کو بنیاد بنا کر اپنی رسوائے زمانہ کتاب ''شیطانی آیات'' ترتیب دے ڈالی۔

۱۰- اس کتاب میں عصمت انبیائے کرام کے متفقہ عقیدہ کو مجروح کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔

۱۱- عبس و تولّٰی اور ابن مکتوم رضی اللہ عنہ پر بحث کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں کہ ان سے منہ پھیر کر پیغمبر اسلام نے گویا کافرانہ طرز اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا۔

۱۲- وہ جن جنہیں قرآن کریم سن کر حیرت ہوئی، وہ غالبا یہودی تھے، جنہیں پہلے سے ہی تورات کا علم رہا ہوگا۔

مندرجہ بالا چند الزامات مَیں نے مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت سے پیش کیا ہے ورنہ حقیقت میں مستشرقین کی سینکڑوں کتابیں اس طرح کے الزامات سے بھری پڑی ہیں۔

مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی نے ان تمام بے بنیاد الزامات کے تحقیقی جوابات اپنے اِنتہائی خوب صورت اسلوب تحریر میں قلم بند فرمائے ہیں۔

تحقیق اور ری سرچ سے متعلق تحریریں عام طور پر غیر ادبی اور خشک ہوتی ہیں، تاہم مولانا زرقانی کی تحریر میں علامہ ارشد القادری ﷫ کی تحریروں کا ادبی اسلوب بہت زیادہ نمایاں ہے، جس کی وجہ سے قاری کہیں بھی تھکن کا احساس نہیں کرتا، بلکہ تحریر کا حسن و جمال اسے کتاب کو مکمل پڑھ لینے کے لیے بے چین کر دیتا ہے۔

خدائے وحدہ قدوس کا بے پناہ شکر ہے کہ مولانا زرقانی نے مستشرقین کے علمی احتساب کا آغاز کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ وہ اپنے پختہ قلم کو اس کام کے لیے وقف کر دیں اور صلیبی جنگوں میں شکست کھانے کے بعد سے لے کر تا ہنوز کئی سو سال کی اِستشراقی تحریروں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جو غلط اور بے بنیاد الزامات لگائے گئے ہیں، ان کا بھی جواب دیں تا کہ علمائے ملت اسلامیہ اور طالبان علوم نبوت دنیا کے گلوبل ویلج میں تبدیل ہو جانے کے بعد نہ صرف ہر چہار جانب سے کیے جانے والے حملے کو بے نقاب دیکھیں، بلکہ ان کے جوابات کی روشنی میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا حسین ترین چہرہ بھی دیکھ سکیں۔

اخیر میں حضرت مولانا زرقانی صاحب سے درخواست گزار ہوں کہ وہ مستشرقین کی کتابوں میں توہین آمیز عبارتوں کا سراغ لگائیں اور اسی طرح اپنے

خوب صورت اسلوب میں جوابات بھی تحریر کریں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اعتراضات پر توجہ فرمائیں:

۱- پیغمبر اسلام ایک عبقری انسان تھے، جنہوں نے اپنی ذہانت سے قرآن جیسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کردی۔

۲- پیغمبر اسلام اپنی قوم کی گمراہیوں اور بدکاریوں سے غمزدہ تھے، اسی لیے انہوں نے جنت ودوزخ کا تصور پیش کیا، تاکہ لوگ جہنم کے خوف اور جنت کی لالچ میں نیک اعمال کریں۔

۳- محمد ﷺ نے مکہ میں ایک پیغمبر کا کردار پیش کیا، مگر مدینہ میں وہ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے ابھرے۔

۴- پیغمبر اسلام نے صحرانشینوں کو جمع کر کے خوشحال ملکوں پر حملہ کیا، تاکہ انہیں بہتر معاشی زندگی دلاسکیں۔

۵- وحی پاک کی کیفیت دراصل مرگی تھی، وہ معاذ اللہ مرگی کے مریض تھے۔

۶- پیغمبر اسلام نے ورقہ ابن نوفل اور اسی طرح دوسرے لوگوں سے توریت وانجیل کی تعلیمات حاصل کر کے قرآن مرتب فرمایا، لہٰذا قرآن مقدس توریت وانجیل کا چربہ ہے۔

۷- پیغمبر اسلام کو بحیرہ راہب نے تعلیم دی اور انہوں نے قرآن مرتب فرمایا۔

۸- پیغمبر اسلام کی شادیوں کے حوالے سے گستاخانہ عبارتیں۔

ربّ قدیر مولانا زرقانی مدظلہ العالی کو جزائے خیر عطا فرمائے اور دفاع رسالت مآب ﷺ کے صدقے میں دونوں جہان کی برکتوں سے مالا مال فرمائے۔ آمین بجاہ حبیبہ الکریم۔

تعارف

کیرن آرمسٹرانگ (**Karen Armstrong**) کی پیدائش ۱۴رنومبر ۱۹۴۴ء کے دن برطانیہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سینٹ این کالج، آکسفورڈ میں داخلہ لیا، جہاں سے امتیازی نمبروں کے ساتھ کام یابی حاصل کرنے کے بعد مشہور مغربی شاعر ٹائسن پر پی ایچ ڈی کے لیے رسالہ تیار کیا۔ افسوس کہ یہ رسالہ ممتحن نے قبول نہیں کیا اور وہ ڈاکٹریٹ کی مروجہ ڈگری سے محروم رہیں۔ اسی دوران مصنفہ نے سات سالوں تک رومن کیتھولک چرچ میں نن کی حیثیت سے گزارے۔ اس کے بعد مصنفہ نے انگریزی کی ٹیچر کی حیثیت سے کچھ عرصے ملازمت اختیار کرلی اور چرچ کی خدمت کے دوران اپنے پیش آمدہ تجربات پر دو کتابیں لکھیں۔

۱۹۸۴ء میں برطانوی ذرائع ابلاغ نے انہیں سینٹ پال پر ایک ڈاکومنٹری بنانے کے لیے اسکرپٹ لکھنے کی ذمہ داری سونپی۔ یہی تاریخی خدمت ان کی عالمی شہرت کے لیے سنگ میل ثابت ہوئی۔

کیرن کو مذہبی امور پر لکھنے والے دنیا کے چند معتمد مصنفین میں سے شمار کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اسلام کے حوالے سے لکھی ہوئی ان کی تحریریں مسلمانوں کے درمیان بھی متوازن، غیر جانب دار اور عدل وانصاف پر مبنی سمجھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دنیائے اسلام کے معروف مصنف مولانا وحیدالدین خان مصنفہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''برطانیہ کی خاتون اسکالر کرن آرمسٹرانگ (**Karen Armstrong**) ایک منصف مزاج خاتون ہیں۔ اسلام کے بارے میں ان کی تحریریں عدل و انصاف پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کی ایک قابل مطالعہ کتاب لندن سے ۱۹۹۱ء میں چھپی ہے۔ اس کا نام

Muhammad: A western attempt to understand Islam''(۱)

مصنفہ نے اسلام، عیسائیت، یہودیت اور بدھ مذاہب کے بارے میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ چوں کہ میدان تحقیق مذاہب ہے، اس لیے ان کی دوسری کتابوں میں بھی مذہبی پس منظر کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی اب تک لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد بیس سے زائد بتائی جاتی ہے۔

دنیائے علم ومعرفت میں مصنفہ کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام مذاہب کے حوالے سے منعقد ہونے والے سب سے بڑے اجتماع کے تین مقررین میں سے ایک کیرن آرمسٹرانگ تھیں۔ انہیں کئی عالمی ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ جن میں ۱۹۹۹ء میں مسلم پبلک افیئر کاؤنسل ایواڈ، ۲۰۰۸ء میں **TED** انعام مع ایک لاکھ ڈالر نقد، ۲۰۰۸ء فریڈم ورشپ ایوارڈ، ۲۰۰۹ء میں ڈاکٹر لیوپارڈ لوکس انعام اور ۲۰۱۱ء میں نیشنل انسائیکلوپیڈیا ایوارڈ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اسی کے ساتھ کیرن آرمسٹرانگ کو ۲۰۰۶ء میں **Alston University** سے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا اور ۲۰۱۱ء میں **University of Saint Andrews** سے بھی انہیں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ مصنفہ نے پوری دنیا میں مذہبیات کے حوالے سے منعقد ہونے والے کئی عالمی

۱- رہنمائے حیات، ص:۶۹

اجتماعات اور سیمیناروں میں شرکت کی ہے۔

زیر بحث کتاب:

کرین آرمسٹرانگ کے قلم سے لکھی ہوئی ***Muhammad A prophet for our time*** میری میز پر ہے۔ مصنفہ نے ویسے تو یہ کتاب کئی سال پہلے لکھی تھی، لیکن ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حملے کے بعد اسے از سر نو مزید اضافہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ مصنفہ کہتی ہیں کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد نبی اکرم ﷺ کے حوالے سے جس قسم کی رائے بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی وہ عدل و انصاف اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی کے مترادف تھی۔

"Since the destruction of the World Trade Center on September 11, 2001, members of the Christian Right in the United States and some sectors of the Western media have continued this tradition of hostility, claiming that Mohammad was irredeemably addicted to war. Some have gone so far as to claim that he was a terrorist ......"(۱)

''۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد امریکہ میں عیسائی دستے اور بعض مغربی ذرائع ابلاغ نے اسی متعصبانہ ذہنیت کی عکاسی کرتے ہوئے کہہ دیا کہ محمد (ﷺ) تو جنگ و جدال کے خوگر تھے۔ اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ایک دہشت گرد تھے......'' (معاذ اللہ)

۱- زیر بحث کتاب، ص:۱۸

مصنفہ کہتی ہیں کہ اس طرح کی متعصبانہ ذہنیت دنیا کی سلامتی کے لیے نہایت ہی خطرناک ہے۔ اسی قسم کی باتیں مسلمانوں کے جذبات کو ہوا دیتی ہیں۔ بہتر ہوتا کہ ہم تاریخی حقائق کی روشنی میں ان کی شخصیت کا جائزہ لیتے اور وہ کہتے جو واقعی عدل و انصاف کے تقاضے کے مطابق ہے۔ اس ذہنی آلودگی کی تردید کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"Muhammad was not a man of violence. We must approach his life in a balanced way, in order to appreciate his considerable achievements."(۱)

''محمد فتنہ پسند طبیعت کے مالک نہیں تھے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ توازن کے ساتھ ہم ان کی شخصیت کا جائزہ لیں تاکہ ان کے قابل قدر کارناموں کی پذیرائی کی جاسکے۔''

یہی وہ دواعی تھے جن کی وجہ سے موجودہ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر مصنفہ نے ازسرنو اپنی کتاب پر نظرِ ثانی کی۔ یہ اور بات ہے کہ ''عدل وانصاف''، ''تحقیق وتدقیق'' اور ''غیر جانب دارانہ'' اسلوب بیان کے پرکشش دعووں کے باوجود مصنفہ اپنے قلم کے وقار کو مجروح ہونے سے نہ بچاسکیں۔ کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ثانوی درجے کے مصادر ومراجع پر انحصار کرنے کی وجہ سے حقیقت سے دور جانکلی ہیں مگر بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں یقین ہوجاتا ہے کہ وہ دیدہ ودانستہ حقیقت کا چہرہ مسخ کرنے کی مذموم کوششیں کررہی ہیں۔

اس حقیقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ سرکارِدوعالم ﷺ کی کتابِ زندگی کا ایک ایک صفحہ تاریخ کے اجالے میں آفتابِ نیم روز کی طرح عیاں ہے۔ بلکہ کہنے والوں

۱۔ زیر بحث کتاب، ص:۱۸

نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ عیسائی اور یہودی اپنے مذہبی، علمی اور تاریخی اثاثوں کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ تو درکنار ان کے وجود کو بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ وہ عصر حاضر کے مروجہ تاریخی معیار کے مطابق یہ تک کہنے کی جرات نہیں کر سکتے کہ اس طرح کے ناموں کی شخصیتیں دنیا میں پیدا بھی ہوئیں ہیں۔ یہ تو اسلام کی واضح تصریحات ہی کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد کی تصدیق ہو جاتی ہے، بلکہ ان کی بعض تعلیمات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور ان کی تحریک کو عہد حاضر کے تاریخی، علمی اور تحقیقی معیار کے پردے میں دیکھتے ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ آپ کا ایک ایک لمحہ تاریخ کے آئینے میں آفتاب نیم روز کی طرح عیاں ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ نہ صرف آپ کی حیاتِ طیبہ اور تعلیمات کے مختلف گوشے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں، بلکہ ان لوگوں کے احوال و کوائف بھی تحریروں میں مقید ہیں، جنہوں نے آپ کے حوالے سے اس قیمتی سرمایہ کو پوری بشاشت قلبی، دیانت داری اور راست بازی کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے۔

کتاب کے ابتدائیہ میں اسی روشن و تابناک حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنفہ کہتی ہیں:

> ***"Largely as a result of their efforts, we know more about Muhammad than about nearly any other founder of a major religious tradition."*** (۱)

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۸

"انہی کی کوششوں کی وجہ سے ہم آج دنیا کے تقریباً کسی بھی بڑے مذہب کے بانی کے مقابلے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے ہیں۔"

اس میں دو رائے نہیں کہ کہیں کہیں مصنفہ کے قلم سے نہایت ہی قیمتی جملے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گئے ہیں۔ یہ زبان کے لحاظ سے بھی بہت وقیع ہیں اور حقیقت پسندی کے اعتبار سے بھی بہت اہم۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت سے کسی مسلمان کو کیوں کر انکار ہو سکتا ہے، لیکن ماتھے کی آنکھ سے یہ حقیقت پسندانہ پیرایہ بیان پڑھیے کہ سیرت نبوی کی ضرورت صرف مسلمانوں ہی کو نہیں ہے بلکہ دنیا میں عدل و انصاف، امن و امان اور صلح و بھائی چارگی کی فضا پیدا کرنے کے لیے مغرب بھی آپ کی انسانیت دوست سیرت طیبہ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ مصنفہ کے الفاظ میں:

"As a paradigmatic personality, Muhammad has important lessons, not only for Muslims, but also for Western people. His life was a jihad: as we shall see, this word does not mean 'holy war,' it means 'struggle.' Muhammad literally sweated with the effort to bring peace to war-torn Arabia, and we need people who are prepared to do this today. His life was a tirelesss compaign against greed, injustice, and arrogance." (۱)

۱۔ زیر بحث کتاب، ص: ۱۸

"ایک مثالی شخصیت کی حیثیت سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ مغربی عوام کے لیے بھی بہترین درس ہے۔ ان کی ساری زندگی جہاد سے عبارت ہے، جیسا کہ ہم دیکھیں گے جہاد کا مطلب 'مقدس لڑائی' نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی ہیں 'جد و جہد' کرنا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جنگ زدہ عرب میں امن و امان کی فضا قائم کرنے کے لیے واقعی انتہائی کوششیں کیں۔ آج ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے، جو اسی طرح کی جدوجہد کے لیے تیار ہوں۔ آپ کی زندگی لالچ، ظلم و ستم اور غرور و تکبر کے خلاف ایک منظم جدوجہد کا نام ہے۔"

یہاں پہنچ کر یہ کہنا حالات کی صحیح عکاسی ہوگی کہ حق وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے اور اپنے تو اپنے غیر بھی جس کے حق ہونے کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں وہ واقعی سب سے بڑھ کر حقیقت ہے۔ چند سر پھرے لاعلمی کی بنیاد پر اگر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے متاثر نہیں تو یہ ان کی بدنصیبی ہے، لیکن تاریخ کا یہ سچ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے کہ عدل و انصاف کی عینک سے جس کسی نے بھی آپ کی شخصیت کو قریب سے دیکھا ہے، وہ آپ کی انسانیت دوستی، عدل و انصاف، راست بازی، خوش گفتاری اور یکتائے روزگار فضائل و کمالات کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مثال آپ کے سامنے ہے کہ موصوفہ جانب مخالف کے خیمے سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن جب سیرت طیبہ پر قلم اٹھانے کے لیے امہات مصادر اور مراجع سے قریب ہونے کا موقع ملا تو آپ کے ذریعہ لائے گئے صحت مند انقلاب کے دوررس مثبت نتائج سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

اب آیئے ہم اپنے سرنامہ سخن کی طرف واپس پلٹتے ہیں اور بیشتر کتاب کی ان کمین گاہوں کا سراغ لگاتے ہیں، جہاں سے ہمارے مذہبی سرمایہ افتخار کو نشانہ بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

حدیث کی واقعی حیثیت

اپنی اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں لگتا ہے کہ مصنفہ نے ان مستشرقین کی نام نہاد تحقیق پر اِنحصار کیا ہے جو "حدیث" کی اہمیت تاریخی طور پر کم کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی اثاثہ ہی بے وقعت ہو جائے تو دینی اقدار پر شب خون مارنا نہایت ہی آسان ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین اسلام کی ظاہری ستائش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بنیادوں کی بیخ کنی پر اپنی توجہ ہمیشہ مرکوز رکھتے ہیں۔ بس موقع ملا اور کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے قاری مشکوک ہو گیا۔ یہی شک وشبہ دھیرے دھیرے پروان چڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ قاری اتنا بے باک ہو جاتا ہے کہ وہ نام کا مسلمان تو رہتا ہے، لیکن عقیدہ وعمل کے اعتبار سے وہ اسلامی قدروں کے کسی خانے میں رکھنے کے لائق نہیں رہتا۔

ذیل کے اقتباس میں دیکھیے کہ کس طرح حدیث کی تاریخی حیثیت کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے!

"A little more than a hundred years after Muhammad's death, as Islam continued to spread to new territories and gain converts, Muslim scholars began to compile the great collections of Muhammad's sayings

(ahadith) and customary practice (sunnah), which would form the basis of Muslim law."(۱)

''محمد (ﷺ) کی وفات کے تقریباً سو سالوں کے بعد جب نئے نئے علاقے دامنِ اسلام سے وابستہ ہونے لگے اور بڑی تعداد میں لوگ بھی حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تو مسلم دانش وروں نے محمد کے ارشادات اور ان کے عادات واطوار کو یکجا کتابی شکل میں دینے کی تحریک شروع کی، جو کہ مسلم قانون کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔''

اسے کہتے ہیں سونے کی پر کشش، دیدہ زیب اور مرصع پیالی میں میٹھے زہر کی ایک چسکی۔ یہ ہے تو ایک بوند مگر نتیجے کے اعتبار سے اسلامی اقدار کے گہرے سمندر کو آلودہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مذہب اسلام سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ صراط مستقیم کی تعیین میں حدیث کی اہمیت کیا ہے؟ حدیث ہی وہ قیمتی سرمایہ ہے جو نہ صرف بہت سارے معاملات میں ہماری رہنمائی کرتا ہے بلکہ وہ قرآن کریم کے کئی اہم مقامات پر مفاہیم اور مدلولات کے صحیح رخ کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ گویا سرمایہ حدیث ہی اگر تاریخی اعتبار سے کم زور ہو جائے تو پھر قرآن کے واقعی مفاہیم کی تعیین بھی خطرے کی زد پر ہو جائے گی۔

کون نہیں جانتا کہ جب سو سال کے طویل عرصے کے بعد کسی عام شخص کے عادات واطوار، نشست و برخاست اور ارشادات کو قلم بند کیا جائے، تو اسے تاریخی اعتبار سے بہت مضبوط نہیں کہا جا سکتا۔ اگر یہ مفروضہ صرف غیر مسلموں کے حلقہ ہی میں رہ جاتا تو شاید اس قدر افسوس نہ ہوتا، لیکن کیا کہا جائے کہ بہ زبان خویش دانش ور

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۴۰

کہلانے والے مسلم مؤرخین کا بھی ایک طبقہ اسی دام فریب کا اسیر ہے۔

چوں کہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور اسے اسی طرح تشنہ چھوڑ دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا، اس لیے ہم ذیل میں تاریخی شواہد کی بنیاد پر دیکھیں گے کہ اس بے سر و پا دعوے کی حقیقت کیا ہے؟

عہدِ رسالت میں تدوین حدیث:

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قرونِ اولیٰ کے عربوں کا حافظہ محیر العقول ہوا کرتا تھا۔ اپنے آباء و اجداد کے فضائل و مناقب، سخاوت و مہمان نوازی اور شجاعت و بہادری کے قصص پر مشتمل ہزاروں اشعاروں کا نوک زبان پر رکھنا ان کے لیے قطعی دشوار نہ تھا۔ اسی لیے وہ اپنے مرکز عقیدت کے فرمودات کو بھی پوری دیانت داری کے ساتھ یاد کر لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ کہنا کہ حدیث کی تدوین نبی ﷺ کی وفات کے سو سالوں کے بعد ہوئی ہے، تاریخی حقائق و شواہد کے ساتھ بہت بڑی نا انصافی کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ ہمیں ایسی علامتیں ملتی ہیں جن سے یہ یقین آفتاب نیم روز کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ بعض صحابہ کرام عہد رسالت مآب ﷺ میں بھی احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر چند شواہد ملاحظہ فرمائیں!

۱- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سینکڑوں احادیث پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا تھا جس کا نام صادقہ تھا۔

"عن عبد الله بن عمرو قال : استأذنت النبی فی کتاب ما سمعت منه ، فأذن لی فکتبته فکان عبد الله یسمی صحیفته تلك الصادقة ...... عن مجاهد قال: رأیت عند عبد الله بن عمر وبن العاص صحیفته فسألت عنها: فقال: هذه

الصادقة فیھا ما سمعت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس بینی و بینہ فیھا احد۔"(۱)

یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی تا کہ جو میں ان سے سنوں اسے لکھ لیا کروں، تو آپ نے اجازت دے دی۔ میں نے اسے لکھ کر ایک کتاب میں جمع کر لیا جس کا نام 'صادقہ' تھا۔

مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پاس ان کی وہ کتاب دیکھی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا یہ کیا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ صادقہ ہے جس میں وہ سب کچھ لکھا ہوا ہے جو میں نے بہ راہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ ان روایتوں کے حوالے سے میرے اور ان کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ

"**ما کان احد اعلم بحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منی الا عبد اللہ بن عمرو، فقد کان یکتب و لا اکتب**"(۲)

"حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی اور نہیں سوائے عبد اللہ بن عمر کے کیوں کہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔"

۲- ایک انصاری صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنے حافظے کے کم زور ہونے کی شکایت کی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لکھنے کی تلقین کی۔

"**روی الترمذی عن ابی ھریرہ، قال: کان رجل من الانصار یجلس الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یسمع منہ الحدیث فیعجبہ**

۱- طبقات کبریٰ لابن سعد، ج:۲، ص:۲۷۱

۲- بخاری، کتاب العلم، ج:۱، ص:۳۱۳

و لا يحفظه ، فقال له النبی صلی اللہ علیہ وسلم :استعن عليه بيمينك، و أومأ بيده الى الخط ''(۱)

ترمذی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ایک انصاری سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ آپ کی حدیث سے وہ متاثر ہوتا لیکن اسے یاد کرنے سے قاصر تھا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: تم اپنے داہنے ہاتھ کی مدد لو اور اپنے ہاتھ سے لکھنے کی طرف اشارہ کیا۔

۳- حضرت سعد بن عبادۃ نے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لکھی۔

''انهم وجدوا فی كتاب سعد بن عبادة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضٰی باليمين مع الشاهد ''(۲)

لوگوں نے سعد بن عبادہ کی تحریر کردہ کتاب میں یہ دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہ کے ساتھ قسم کھلا کر فیصلہ فرمایا۔

۴- فتح مکہ کے دن ابو شاہ نامی ایک شخص یمن سے آیا اور اسنے خطبہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اسے لکھ دیا جائے۔ آپ نے اس کی گزارش قبول کرتے ہوئے صحابہ کو ہدایات قلم بند کرنے کا حکم دیا۔

''فجاء رجل من اهل اليمن يقال له ابو شاه ، فقال :اكتب لی يارسول اللّٰه ، فقال :اكتبوا لابی شاه۔''(۳)

''ابوشاہ نام کا ایک شخص یمن سے آیا اور عرض کرنے لگا: یارسول اللہ! میرے لیے اسے لکھ دیجیے! آپ نے فرمایا: اے صحابہ! ابوشاہ کے لیے لکھ دو!''

۱- ترمذی، ج:۷، ص:۴۰۲، دار الکتب العلمیہ

۲- الاکمال فی ذکر من لہ روایۃ فی مسند احمد، ج:۲، ص:۵۶۹، دار الفکر العربی

۳- مسلم، ج:۹، ص:۱۰۹

۵- حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی لکھی ہوئی شکل میں احادیث کا مجموعہ تھا۔ ایک بار منبر پر دوران خطبہ آپ نے فرمایا:

"والله ما عندنا كتاب نقرأه الا كتاب الله و هذه الصحيفة"(۱)

"اللہ کی قسم ہمارے پاس سوائے اللہ کی کتاب اور اس صحیفہ کے کوئی دوسری کتاب نہیں، جسے ہم پڑھتے ہوں۔"

اسی طرح کئی جلیل القدر صحابہ کے حوالے سے محققین علماء کرام نے صحت مند تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ان کی تحویل میں احادیث کا معتد بہ ذخیرہ موجود تھا۔ مزید معلومات کے لیے تدوین احادیث کے موضوع پر لکھی گئی کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہاں پر اس حدیث کا تذکرہ کرنا نہایت ضروری ہے جس سے بعض کو یہ وہم ہوگیا ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کے قلم بند کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا تھا۔ وہ حدیث یہ ہے جسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا تكتبوا عنى شيئا الا القرآن، فمن كتب عنى شيئا فليمحه"(۲)

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کے علاوہ کوئی چیز میرے حوالے سے نہ لکھو اور جس نے کچھ بھی میرے حوالے سے لکھا ہو وہ اسے مٹادے۔"

مستند تاریخی اعتبار سے کچھ کہنے سے قبل مندرجہ بالا حدیث کے بارے میں علمائے فن حدیث کی تحقیق ملاحظہ فرمالیں:

۱- فتح الباری، ج:۱،ص:۲۷۵

۲- مسند احمد، ج:۳،ص:۳۳۹

(الف) خطیب بغدادی نے حدیث کے لکھنے سے منع کرنے اور اجازت دینے والی دونوں طرح کی احادیث نقل کی ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ سوائے ابوسعید خدری کی تمام روایتیں فنی اعتبار سے ضعیف ہیں۔ اور رہی یہ روایت تو اسے بھی علما نے معلل قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کی سند حضرت ابوسعید خدری تک جا کر موقوف ہو جاتی ہے۔

(ب) یہ ممانعت ان لوگوں کے لیے تھی جن کے لیے قرآن اور حدیث کے لکھتے وقت ضروری امتیاز کرنا مشکل تھا۔

(ج) اس ممانعت سے مراد یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کو ایک ہی جگہ پر نہ لکھو۔

(د) ممانعت کا یہ حکم ابتدا میں تھا بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اس رائے کی تقویت کے لیے حضرت عبداللہ بن عمرو کی یہ روایت محدثین نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"عن عبد اللہ بن عمرو : قلت یا رسول اللہ! انی اسمع منك اشیاء فاکتبھا ، قال :نعم ، قلت :فی الغضب و الرضا؟ قال :نعم ، فانی لا اقول فیھما الا حقا"(۱)

"حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ کی زبان سے بہت کچھ سنتا ہوں جسے لکھ لیا کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے، میں نے عرض کیا: خوشی اور غصہ ہر دو حالتوں میں؟ آپ نے فرمایا: یقیناً اس لیے کہ میں ہر دو حالتوں میں حق کے سوا نہیں کہتا۔"

ایک دوسری روایت میں تو نہایت صراحت کے ساتھ یہ اضافہ بھی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کا حکم بھی دیا۔

۱- مسند احمد، ج:۲، ص:۲۲۴

حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں جو کچھ سرکار دو عالم ﷺ سے سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا۔ میرے بعض احباب مجھ سے کہنے لگے کہ تم ان کی باتیں خوشی اور غصے ہر دو حالتوں میں لکھ لیتے ہو؟ لہٰذا میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ بعد میں موقع میسر آیا تو میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے اس واقعے کا تذکرہ کیا۔ سرور کائنات ﷺ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا حق"(۱)

یعنی تم لکھو، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

صراحت کے ساتھ احادیث لکھنے کے حوالے سے یہ ذکر صرف حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک ایسی بھی روایت ملتی ہے جس سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ احادیث کے قلم بند کرنے کا شرف صحابہ کی ایک جماعت کو حاصل تھا۔

"عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ قال: کان رسول اللہ ﷺ ناس من اصحابہ و انا معھم وانا اصغر القوم ، فقال النبی ﷺ: من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار، فلما خرج القوم قلت: کیف تحدثون عن رسول اللہ ﷺ و سمعتم ما قال، وانتم تنھمکون الحدیث عن رسول اللہ ﷺ فضحکوا ، فقالوا: یا بن اخینا! ان کل ما سمعنا منہ عندنا فی کتاب"(۲)

"عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگ حاضر تھے

۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۶، ص:۲۲۹، دار الفکر

۲۔ مجمع الزوائد، ج:۱، ص:۳۸۰، دار الفکر

جب کہ میں ان سبھوں میں سب سے کم عمر تھا کہ اتنے میں آپ نے فرمایا: جو میری طرف کوئی جھوٹی بات قصداً منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔ جب لوگ باہر نکلے تو میں نے عرض کیا: جو حضور ﷺ نے فرمایا وہ آپ لوگوں نے سنا، اس کے باوجود آپ لوگ کثرت سے کیسے حدیثیں بیان کرتے ہیں؟ میری اس بات پر وہ ہنسے اور کہنے لگے: اے میرے بھائی کے بیٹے! ہم نے جو کچھ ان سے سنا ہے، وہ سب ہمارے پاس لکھی ہوئی صورت میں موجود ہے۔''

اسی طرح حضرت سعید بن جبیر کہتے تھے کہ میں حضرت ابن عمر سے جو احادیث سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا۔ حضرت بشیر بن نہیک نے حضرت ابو ہریرہ کی روایات لکھ کر انہیں سنایا اور ان سے تصدیق کروائی۔ حضرت ابان مشہور تابعی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ساگوان کی تختیوں پر احادیث لکھا کرتے تھے۔(۱)

بات طویل ہو جائے گی ورنہ اس حوالے سے مزید دلائل و براہین کی جانب اشارے کیے جاتے۔ بہ ہر کیف اتنی گفتگو سے یہ بات دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ظاہری حیات طیبہ میں بھی آپ کی احادیث قلم بند کی جاتی رہی ہیں۔ اور آپ کے وصال کے بعد صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم نے بھی پوری دیانت داری کے ساتھ احادیث کی جانب توجہ دی۔ یہ نفوس قدسیہ زبانی طور پر بھی احادیث کی محفلیں سجا کر اسے دوسروں تک پہنچاتے رہے اور قلم بند کر کے بھی اسے محفوظ رکھنے کا مقدس فریضہ انجام دیتے رہے۔

۱۔ دیکھیے، نزہۃ القاری، ج:۱، ص:۱۵

تدوین حدیث کی اجتماعی تحریک:

اس سے انکار نہیں کہ اب تک حدیث کی نقل وترسیل کا جو بھی کام ہوا، وہ انفرادی نوعیت کا تھا۔ جس نے جہاں کہیں کسی سے حدیث سنی، اسے اپنے اپنے طور پر لکھا اور دوسروں تک پہنچا دیا۔ کہتے ہیں ہر کام کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ تدوین حدیث کی اجتماعی ذمہ داری کا شرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کی قسمت میں تھا۔ کرسی خلافت پر متمکن ہونے کے بعد آپ نے اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور اپنے عہد کے ممتاز محدثین کو اس اہم کام کے لیے مقرر فرمایا۔ یہ تحریک آگے بڑھی اور موجودہ دور میں جو حدیث کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں وہ اسی تحریک کی کڑیاں ہیں۔

×××

غارِ حرا میں عزلت نشینی

کتاب کے پہلے باب میں ابتدائے وحی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت رہا کرتے تھے۔ یہ غار چار گز لمبی اور دو گز چوڑی ہے۔ اس کی وسعت اتنی ہے کہ ایک آدمی آرام سے لیٹ سکتا ہے۔ اب تو یہ مکہ مکرمہ کی آبادی سے جاملا ہے ورنہ اس زمانہ میں یہ آبادی سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ ویسے تو دوسرے پہاڑوں پر اس طرح کے غار موجود تھے، لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنی گوشہ نشینی کے لیے غار حرا کو غالباً اس لیے پسند فرمایا کہ یہاں بیٹھ کر بیت اللہ شریف کی زیارت بھی کی جاسکتی تھی۔ عزت نشینی کے دورانیہ کے حوالے سے روایات میں اختلاف ہے۔ علامہ احمد بن ذینی دحلان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"و ابهم العدد لاختلافه بالنسبة الى المدة فتارة كان ثلاث ليال وتارة كانت سبع ليال وتارة تسع ليال وتارة شهرا رمضان وغيره" (۱)

"قیام کی مدت کو مبہم رکھا کیوں کہ یہ دورانیہ کبھی تین رات، کبھی سات رات، کبھی نو رات اور کبھی رمضان کا مکمل مہینہ ہوا کرتا تھا۔"

غارِ حرا کی عزلت نشینی کے دوران حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ رب العزت کا پیغام لے کر بارگاہ مصطفیٰ ﷺ میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس وقت کی کیفیت کا پس منظر بیان

۱۔ السیرۃ النبویہ، ج:۱، ص:۱۶۳

کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

".........Muhammad could only think that he was being attacked by a Jinni, one of the fiery spirits who haunted the Arabian steppes and frequently lured travellers from the right path."(۱)

''محمد صرف یہی سوچ سکتے تھے کہ وہ عرب کے جنگلات میں پائی جانے والی طلسماتی روحوں میں سے کسی جن کے آسیب میں گرفتار ہو گئے ہیں جو عموماً مسافروں کو راہ مستقیم سے بھٹکا دیا کرتی ہیں۔''

مصنفہ اپنی اس عبارت سے یہ پیغام دینا چاہتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کو معاذ اللہ اپنے منصب نبوت پر فائز ہونے کے حوالے سے کوئی علم نہیں تھا۔ یہ دراصل اسی فکر کی عکاسی ہے جس کے داعی مولانا مودودی کے خیمے سے تعلق رکھنے والے نام نہاد ''محققین'' ہیں۔ اب ذرا دل تھام کر مولانا مودودی کے قلم سے نکلی ہوئی عبارت سنیے:

''نزول وحی کی کیفیت ٹھیک سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی ﷺ کو اچانک اس صورت حال سے سابقہ آیا تھا، آپ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گذرا تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں نہ اس کی کوئی خواہش آپ کے دل کے کسی گوشہ میں موجود تھی، نہ اس کے لیے کوئی تیاری آپ پہلے سے کر رہے تھے اور نہ اس کے لیے آپ متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اوپر سے پیغام لے کر آئے گا، آپ خلوت میں بیٹھ کر مراقبہ اور عبادت ضرور فرماتے تھے لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی

۱۔ زیر بحث کتاب، ص:۲۱

تصور آپ کے حاشیہ خیال میں نہ تھا......"(۱)

زہر میں بجھی ہوئی عبارت کا تیور ملاحظہ کیجیے! ایک ہی فکر کو مختلف زاویہ سے بیان کیا جارہا ہے تاکہ کسی کے ذہن وفکر میں اس حوالے سے ذرا بھر کسی شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ یعنی فکر وبصیرت کی کجی تو رہی ایک طرف، یہاں اپنی خود ساختہ مجتہدانہ بصیرت کو نافذ کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ یہاں پہنچ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مصنفہ کی مذکورہ بالا عبارت بھلے ہی اس کے قلم سے نکلی ہو لیکن روشنائی بہ ہر حال "مودودی فکر" کی دوات سے مستعار لی گئی ہے۔

بات نکل ہی گئی ہے تو اس بنیادی محور کا تذکرہ بھی ضروری ہوگیا ہے، جسے مولانا مودودی نے اپنے موقف پر استدلال کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ يُّلْقٰى اِلَيْكَ الْكِتَابُ"(۲)

"اور تم ہر گز اس کے امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے۔"

بہ قول مولانا مودودی یہ آیت کریمہ صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ معاذ اللہ سرکار دوعالم ﷺ منصب نبوت پر فائز ہونے کے حوالے سے بے خبر تھے۔ چوں کہ گفتگو کا مدار قرآن پاک کی آیت کریمہ سے ہے لہٰذا آیئے ہم مستند علمائے کرام کی تفاسیر کی روشنی میں اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت کریمہ کے مخاطب کے حوالے سے دنیائے اسلام کے علمائے مفسرین کی دو آراہیں:

اول: یہاں بہ ظاہر خطاب رسول اکرم ﷺ سے ہے، لیکن حقیقت میں مخاطب آپ کی امت ہیں۔ یہ تفسیر حبر الامت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔

۱- سیرت سرور عالم: سید ابوالاعلیٰ مودودی، ج:۲، ص:۱۳۶، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ۱۹۸۹

۲- القرآن الکریم، سورت:۲۸، آیت:۸۶

”قال ابن عباس الخطاب فی الظاهر للنبی صلی اللہ علیہ وسلم و المراد به اهل دینه“(۱)

”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہاں خطاب بہ ظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے حالاں کہ اس سے مراد آپ کی امت ہے۔“

یعنی اس رائے کے حاملین کا موقف یہ ہے کہ یہاں آپ کی امت کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تمھیں اس بات کی توقع نہ تھی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اعلانِ نبوت فرمائیں گے۔

دوم: یہاں خطاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ہے، لیکن آیت کریمہ کے اخیر میں موجود استثنائیہ لاحقہ دراصل اس کے صحیح مدلولات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس لیے کہ مکمل آیت یوں ہے:

”وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ يُّلْقٰى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ“(۲)

”اور آپ اللہ کی رحمت کے سوا کسی اور جہت سے کتاب ملنے کی امید نہیں رکھتے تھے۔“

اس رائے کے قائلین میں امام رازی، شیخ آلوسی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ امام رازی مندرجہ بالا آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”كانه قيل و ما القى اليك الكتاب الا رحمة من ربك و يمكن ايضا اجراؤه على ظاهره اى وما كانت ترجو الا ان يرحمك الله برحمة فينعم عليك بذالك اى ما كنت ترجوا

۱۔ تفسیر خازن: شیخ علاء الدین خازن، ج:۳، ص:۴۴۳، دار الکتب العربیہ

۲۔ القرآن الکریم، سورت:۲۸، آیت:۸۶

الا علی ھذا''(۱)

''گویا کہ یہ کہا جارہا ہے کہ آپ کے پروردگار کی رحمت ہی سے کتاب آپ پر نازل ہوئی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے ظاہر پر ہی رہنے دیں، یعنی آپ اللہ کی رحمت سے ہی امید رکھتے تھے، پس یہ انعام آپ پر ہو گیا، یعنی آپ تو بس اسی رحمت سے پر امید تھے۔''

شیخ آلوسی لکھتے ہیں:

''فیکون المعنی ماالقی الیك الکتاب لاجل شیء من الاشیاء الا لاجل الترحمُ او فی حال من الاحوال الا فی حال الترحم''(۲)

یعنی اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کتاب الٰہی کسی اور سبب سے نہیں بلکہ رحمت کے سبب اتاری گئی یا کسی اور حال میں نہیں بلکہ رحمت کے ساتھ بھیجی گئی ہے۔

اسلاف کرام کی مستند تفاسیر کے آئینے میں یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت مذکورہ کا وہ مفہوم جو مولانا مودودی نے اخذ کیا ہے، وہ خلاف واقعہ بھی ہے اور حقیقت سے دور بھی۔ اس کی تائید وہ حدیث پاک بھی کرتی ہے، جسے امام ترمذی، امام احمد، امام ابن شیبہ، امام ہیثمی، امام حاکم وغیرہم سمیت کئی ائمہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

وہ حدیث پاک یہ ہے:

''عن ابی ھریرۃ قال: قالوا یا رسول اللہ متی وجبت لك النبوۃ، قال: و آدم بین الروح و الجسد''(۳)

۱- التفسیر الکبیر: امام فخر الدین رازی، ج:۲۵، ص:۲۳، دار الفکر المعاصر

۲- روح المعانی: شیخ محمود بن عبد اللہ آلوسی، ج:۲، ص:۸۳۱، دار احیاء التراث العربی

۳- ترمذی: امام ابو عیسی ترمذی، ج:۱۰، ص:۶۳، دار الکتب العلمیہ

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے عرض کیا: کب آپ کو منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا؟ آپ نے فرمایا: جب کہ آدم جسم وروح کی منزل طے کر رہے تھے۔"

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ کس قدر وضاحت کے ساتھ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصب نبوت پر سرفرازی کے راز سے پردہ اٹھادیا ہے۔ ان واضح الفاظ کے رہتے ہوئے آیت بالا کا اپنی مرضی کے مطابق مفہوم متعین کرنا کسی طور مناسب نہیں۔ ایک امتی کے لیے یہ روانہیں کہ وہ آقائے نامدار کے ارشادات کے ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے کسی آیت کریمہ کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرے، بلکہ اسے چاہیے کہ وہ ہر حال میں معلم انسانیت کے متعین کردہ نقوش کی روشنی میں ہی اپنی راہیں طے کرے۔ اس لیے کہ جب بھی کوئی شخص مصطفےٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو پس پشت ڈال کر محض اپنی عقل وفہم کے سہارے قرآن فہمی کی کوششیں کرتا ہے وہ گمراہی وضلالت کے غار عمیق میں جا گرتا ہے۔ اور اگر اس وادی ضلالت کی گہرائی ناپنے کا ارادہ ہو تو اسی بحث کے دوران مولانا مودودی کے گستاخ قلم سے نکلے ہوئے یہ جملے پڑھیے۔ مجھے یقین ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی والہانہ عقیدت اسے برداشت نہ کر سکے گی، لیکن کیا کیجیے کہ شرافت ونجابت اور تحقیق وجستجو کا لبادہ اوڑھے ہوئے ایسے نام نہاد علماء کی نشاندہی کرنا بھی ہم سبھوں کا ملی فریضہ ہے۔

نہایت ہی معذرت کے ساتھ دل تھام کر اسے پڑھیے:

"....پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے۔ اگر ان کے تجربہ میں پہلے سے یہ بات آئی ہوتی کہ میاں نبوت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کا انتظار کر رہے ہیں تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ

میاں گھبراتے کیوں ہو جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو اب پیری کی دکان چمکاؤ میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں.....''(۱)

آپ دیکھ رہے ہیں کبر و نخوت اور غرور و تمکنت کے نشے میں ڈوبے ہوئے قلم کی آوارگی کے نشانات.........بہکی ہوئی بے لگام فکر کی مستیاں........اور عقل بے مہار کی اَٹ کھیلیاں........خدارا غیر جانب دار ہو کر عدل و انصاف کی عینک سے مندرجہ بالا عبارت پڑھیے اور اپنے ضمیر کا بے لاگ تبصرہ سننے کے لیے گوش بر آواز رہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بہ فرضِ محال اگر مولانا مودودی کے موقف کے طرف دار ہیں، جب بھی کم از کم اتنی بات تو بہ ہر حال تسلیم کریں گے کہ جس غضبناک لب و لہجے میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے، وہ بارگاہ رسالت مآب میں سر تا سر بے ادبی و گستاخی ہے۔

اور ذرا اپنی فکر کی تعبیر کے لیے چنے گئے جملوں کا پیچ و خم دیکھیے ....انہیں منصب نبوت ''پیر کی دکان'' اور ''کھانے کمانے'' کا دھندہ نظر آ رہا ہے........معاذ اللہ ثم معاذ اللہ........منصب نبوت کے تقدس کو پامال کرنے کی ایسی جرأت........ اللہ کی پناہ!

زیر بحث آیت کریمہ کے مفاہیم کے تعیین کے حوالے سے کبار علمائے کرام کی تحقیق کا خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اسی کے ساتھ جی چاہتا ہے کہ چند باتیں جو پردۂ ذہن میں نمودار ہو رہی ہیں اسے بھی قارئین کی نذر کر دوں۔

پہلی بات: ہم سب کا یہ عقیدہ ہے کہ منصب نبوت ایک شرف ہے جو سر تا سر وہبی ہے کسبی نہیں، یعنی کوئی شخص نبوت و رسالت کا عہدہ اعمال صالحہ اور دعاؤں کی بنیاد پر حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ یہ کلی طور پر مرضی رب پر منحصر ہے، جسے چاہے اس

۱- سیرت سرور دو عالم: مولانا مودودی، ج:۲، ص:۱۳۷

اعزاز سے سرفراز کرے۔ لہٰذا اس آیت کریمہ کے ذریعہ مشرکین کی درپردہ ذہنیت کی نفی کی جارہی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود کسی کوشش سے اسے حاصل نہیں کیا ہے، بلکہ اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل واحسان، رحم و کرم اور عنایات و بخشش سے انہیں نبوت کے منصب جلیلہ پر فائز کیا ہے۔

دوسری بات: اسی طرح قرآن مقدس کے نزول کے لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں اپنی جانب سے کسی خواہش کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ یہ سرتاسر خالق کائنات کی مرضی کے مطابق نازل کیا گیا ہے۔

تیسری بات: ہم اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی اپنی ولادت کے وقت ہی نبوت کے شرف سے سرفراز کردیا جاتا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ اللہ رب العزت کے حکم پر بعد میں نبوت کا اعلان کرتا ہے۔

اس موضوع کو علامہ مفتی احمد یار خاں نعیمی نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر میں عوام کی سہولت کے لیے ایک عام فہم مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں جیسے یہ سمجھ لو کہ ایک شخص کو کسی منصبی ذمہ داری کا اہل بنادیا گیا۔ اب وہ ابھی سے اس عہدے سے منصوب کہلائے گا۔ یہ اور بات کہ عملی طور پر وہ اس علاقے میں پہنچ کر بعد میں اپنی ذمہ داری سنبھالے گا۔ بلا تمثیل سمجھ لیں کہ اسی طرح ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی تو ہیں پہلے ہی سے مگر چالیس سال کے بعد نبوت کی ذمہ داری کے فرائض ادا کرنا شروع فرمارہے ہیں۔ لہٰذا ان کے اعلان نبوت کے دن سے ابتدائے نبوت کو موقت کرنا تاریخی حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ جب یہ بات طے ہوگئی تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلے ہی سے اس منصب جلیلہ پر فائز ہیں، تو پھر انہیں اسے حاصل کرنے کی تمنا کیونکر ہوسکتی ہے کہ یہ تو تحصیل حاصل کے قبیل سے ہوجائے گا، جو منطقی اعتبار سے باطل ہے۔

حقیقتِ وحی

کیرن آرمسٹرانگ نے ابتدائے وحی کے حوالے سے من گھڑت کہانی رچی ہے۔ یہ ایسی کہانی ہے کہ جس کے تانے بانے سیرت کی متداول کتابوں میں کہیں نہیں ملتے۔ بہت ممکن ہے کہ مغربی مستشرقین نے اپنے طور پر اسے لکھا ہو، لیکن ایک تاریخ داں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی کی حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کم زور وسقیم اور بے بنیاد روایات کا سہارا لے۔ مصنفہ اپنے مزعومہ خیالات کے لیے تمہید باندھتے ہوئے کہتی ہیں:

"The Jinn also inspired the bards and soothsayers of Arabia. One poet described his poetic vocation as a violent assault: his personal jinni had appeared to him without any warning, thrown him to the ground and forced him verses from his mouth." (۱)

''عرب کے شعرا اور کہانی سنانے والے جن کے زیر اثر ہو جایا کرتے تھے۔ ایک شاعر اپنی شاعری کو پرتشدد حملہ سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی ہم زاد جنی بغیر کسی پیشگی اطلاع کے اس پر ظاہر ہوئی، اسے زمین پر پٹخ دیا اور اسے منہ سے کلمات ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔''

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۲۱

آپ دیکھ رہے ہیں! گفتگو وحی کے حوالے سے ہو رہی ہے اور اس کے درمیان جن کے ذریعہ انسان کے سحر زدہ ہونے کا تذکرہ .... یہ تمہید ہی بتا رہی ہے کہ مصنفہ بات کا رخ کس جانب لے جانا چاہتی ہیں۔ اسے کہتے ہیں بھولے بھالے قاری کا ذہن مشکوک کرنے کی دانستہ سازش۔ وہ کچھ نہ بھی کہہ کر وہ سب کہنا چاہتی ہیں، جو اسلام سے بغض وعناد رکھنے والے کہا کرتے ہیں۔

اس کے بعد مصنفہ نے ابتداء وحی کے حوالے سے مشہور و معروف روایت کا ایسا من مانی ترجمہ کیا ہے، جو مذکورہ بالا تمہید کا تسلسل بن سکے۔ زہر میں بجھی ہوئی عبارت کا یہ حصہ پڑھیے:

"So, when Muhammad heard the curt command "Recite!" he immediately assumed that he too had become possessed. " I am not a poet," he pleaded...."(۱)

''اسی طرح جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کڑے لفظوں میں یہ حکم سنا کہ 'پڑھیے' تو انہوں نے فوری طور پر یہی سمجھا کہ وہ بھی آسیب زدہ ہو گئے ہیں اور اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ 'مَیں شاعر نہیں ہوں۔'' (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

علمی خیانت کے نشے میں ڈوبے ہوئے قلم کا تیور ملاحظہ فرمائیے .... عقل بے مہار کے متعصبانہ افکار و خیالات کی کارستانیاں تو دیکھیے ....اور ذرا تمہیدی کلمات کے ساتھ چسپاں کی ہوئی خودساختہ تحریر کے تسلسل پر غور کیجیے......... کس عیاری کے ساتھ ایک موہومہ فکر کو حقیقت بنانے کی ناکام کوششیں کی جا رہی ہیں۔

۱۔ زیر بحث کتاب، ص:۲۱

مندرجہ بالا عبارت میں مصنفہ نے دونوں باتیں ایسی کہی ہیں جو کسی اعتبار سے بھی حقیقت تو جانے دیں، حقیقت سے قریب تر بھی نہیں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ حدیث کی معتمد کتابوں سے وہ اصل عبارت نقل کر دی جائے، جس کے حوالے سے مصنفہ نے یہ گفتگو کی ہے، تاکہ حقائق و معلومات دن کے اجالے میں آسکیں۔

اِبتدائے وحی کی کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''....... كَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِراءٍ يتحنَّثُ فيه۔ و هو التعبد۔ الليالى ذوات العَدَدِ، قبل ان يَّنْزِعَ اِلى اهله و يتزوَّدُ لِذلك، ثم يَرجع الى خَديجة فيتزود لمثلها، حتى جاء الحق وهى فى غار حراء، فجاء ه المَلَكُ فقال: اِقْرَأْ ، قَال: مَا انا بِقارئ....... ''(۱)

''.......آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں گوشہ نشیں رہتے اور عبادت میں غرق رہتے۔ اہل خانہ کے پاس واپس جانے سے قبل وہ کئی کئی راتیں یہاں گزارتے، پھر واپس آتے اور دوبارہ کھانے پینے کا سامان لے جاتے، پھر آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے اور خورونوش کا سامان لے کر چلے جاتے یہاں تک کہ اسی غار حرا میں آپ پر وحی نازل ہوئی۔ فرشتہ آپ کے پاس آیا کہا 'پڑھیے' آپ نے فرمایا 'میں نہیں پڑھتا' ....''

یہ وہ مشہور و معروف حدیث پاک ہے جسے امام بخاری نے اپنی کتاب کے پہلے باب میں درج کیا ہے۔ یہ حدیث پاک کئی دوسری مستند کتابوں میں بھی درج ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب غار حرا میں مصروف عبادت تھے اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر بارگاہ ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ پڑھیے۔

۱- صحیح بخاری، ج:۱، ص:۳، دار احیاء التراث العربی

اس کے بعد ایسی کوئی بات روایت میں مذکور نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ نبی ﷺ کو اس وقت معاذ اللہ یہ گمان ہوا کہ آپ پر آسیبی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ یہ کتنی بڑی علمی خیانت ہے کہ محسن انسانیت کی سیرت کے حوالے سے لکھنے کے دوران حالات کا خود ساختہ تجزیہ کیا جائے اور اپنی من گھڑت فکر کا پیوند بھی لگا دیا جائے۔ مستشرقین کے حوالے سے میرے سابقہ تجربات بتاتے ہیں کہ یہ مزعومہ خیالات نادانستگی میں صفحہ قرطاس پر منتقل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ یہ رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کو داغ دار کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہیں۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ ابتدائے وحی میں خود سرکار دو عالم ﷺ کو یہ یقین نہیں تھا کہ وہ اللہ کے نبی ہیں۔

اور یہ بھی تو دیکھیے کہ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے فرشتے کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ "میں پڑھنے والا نہیں۔" عربی میں "قاری" کے معنی ہوتے ہیں "پڑھنے والا"۔ خدارا انصاف کیجیے! اپنی مزعومہ فکر کو حقیقت کے لبادہ میں پیش کرنے کے لیے مصنفہ نے کس بے دردی کے ساتھ عربی زبان کا خون کیا ہے؟ عربی زبان کی مستند لغات کا ورق ورق چھان لیجیے، کہیں بھی وہ مفہوم آپ کو نظر نہیں آئے گا جسے مصنفہ نے قلم بند کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے اپنی غلط فہمی کی بنیاد پر اسے لکھ دیا ہوگا، اس لیے کہ "غلط فہمی" کی بھی کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے، غلط فہمی کی عمارت یوں ہی فضا میں قائم نہیں ہوتی، یہ اور بات ہے کہ وہ بنیاد ایسی کم زور ہوتی ہے، جو حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ دانستہ طور پر مصنفہ نے رسولِ اکرم ﷺ کی پاکیزہ سیرت کو مسخ کرنے کی قابل مذمت اقدام کیا ہے۔ اس طرح ایک طرف وہ علمی خیانت کی مرتکب ہوئی ہیں اور دوسری جانب لوگوں کے دلوں سے رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت و بزرگی، شرافت و پاک دامنی اور فضائل و کمالات کو کم کرنا چاہتی ہیں۔

بات نکلی ہے تو یہ بھی سن لیا جائے کہ مذکورہ بالا ترجمہ کے لحاظ سے ایسا نہیں ہے

کہ صرف مستشرقین نے ہی ٹھوکریں کھائی ہیں، بلکہ بعض نام نہاد علمائے دین نے بھی اس کا وہ مفہوم نکالا ہے جو کسی طور پر بھی دوسرے صراحت کے ساتھ دیے گئے بیانات سے لگا نہیں کھاتا۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھیے!

"ما انا بقارئ"(۱)

"میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔"

لفظ "قارئ" عربی قواعد کے مطابق "اسم فاعل" ہے جس کا ترجمہ "پڑھنے والا" ہونا چاہیے نہ کہ "پڑھا ہوا"۔ اس طرح "پڑھا ہوا" ترجمہ کرنا عربی قواعد کے مطابق بھی درست نہیں۔ اب ذرا آپ ﷺ کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہونے والے مکالمہ کا پس منظر دیکھیے۔ اللہ کے نبی ﷺ کی مادری زبان تھی، بلکہ آپ کو "افصح الناطقین بالضاد" کے کلمات سے یاد کیا جاتا ہے یعنی "حرف ضاد کو نہایت فصاحت کے ساتھ ادا کرنے والے" یہ کلمہ کنایۃً اس شخص کے لیے بولا جاتا تھا جو زبان عربی میں کمال رکھتا ہو۔ بہر کیف آپ کی زبان بھی عربی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام عربی زبان ہی میں کہہ رہے ہیں کہ پڑھیے۔ اب اگر آپ کے دیے گئے جواب کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" تو یہ جواب کسی طرح بھی سوال سے مطابقت ہی نہیں رکھتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ جس کی مادری زبان اردو ہے، اس سے اگر کہا جائے کہ پڑھو "اللہ ایک ہے" تو گرچہ وہ کسی اسکول سے سند یافتہ نہ، آسانی کے ساتھ اسے زبان سے ادا کر دے گا کہ اس کی مادری زبان اردو ہے۔ بلا تمثیل یوں سمجھ لیں کہ اگر حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی الٰہی کو کسی کتابی شکل میں لے کر آتے اور مطالبہ کرتے کہ اسے پڑھیے اور آپ کہتے "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" تو بہ فرض محال منطقی طور پر یہ جواب درست ہو سکتا تھا، یہ اور بات کہ اسے دوسرے دلائل سے غلط قرار دے دیا

۱۔ صحیح بخاری، ج:۱، ص:۳، دار احیاء التراث العربی

جاتا۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ ایسی کوئی روایت نظر سے نہیں گزری جو یہ اشارہ کرے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کتابی شکل میں وحی الٰہی لے کر غار حرا میں حاضر ہوئے تھے۔

اس موقع پر شارح بخاری علامہ شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی خوب صورت بات تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نیز یہ ترجمہ محاورۂ عرب کے مطابق بھی ہے کہ یہ ترکیب حال یا استقبال کے لیے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ قبل فتح مکہ حضرت ابوسفیان تجدید صلح کے لیے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ کر ان سے درخواست کی کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کر دیں تو حضرت صدیق اکبر نے فرمایا: 'ما انا بفاعل '' یعنی مَیں نہیں کروں گا۔ خود قرآن مجید میں برادران یوسف کا قول مذکور ہے 'و ما انت بمؤمن لنا' یعنی آپ ہمارا یقین نہیں کریں گے۔''(۱)

مجھے یہ لکھتے ہوئے بڑا قلق ہو رہا ہے کہ ہماری جماعت کے ایک مشہور و معروف مترجم مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہان پوری نے بھی بخاری شریف کا ترجمہ کرتے ہوئے بے خیالی میں ''ما انا بقاریٔ'' کا ترجمہ ''میں پڑھا ہوا نہیں'' لکھ دیا ہے۔(۲)

غار حرا میں پہلی وحی الٰہی کے نازل ہونے کے بعد کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے کیرن آرمسٹرانگ رقم طراز ہیں:

".......But at this time, he did not understand what was happening."(۳)

''لیکن اس وقت وہ نہ سمجھ سکے کہ کیا ہو رہا ہے۔''

۱- نزہۃ القاری، ج:۱، ص:۱۹۲، دائرۃ البرکات، ۱۹۸۴ء

۲- دیکھیے، ترجمہ بخاری: مولانا عبدالحکیم خاں، ج:۱، ص:۹۵، فرید بک ڈپو

۳- زیر بحث کتاب، ص:۲۲

یہ کتنی خطرناک عبارت ہے، اس کا اندازہ وہ لوگ آسانی سے کر سکتے ہیں، جنہیں مستشرقین کی درپردہ سازشوں کا ادراک ہے۔ مصنفہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ وحی الٰہی کے نزول کے بعد بھی خود سرکار دوعالم ﷺ شش و پنج میں رہے۔ یعنی اس طرح وہ اسلام کے بنیادی ماخذ کو ہی مشکوک بنا دینا چاہتی ہیں، جب کہ تاریخی اعتبار سے ایسی کوئی روایت نہیں ملتی، جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ مہبط وحی الٰہی ﷺ کسی بھی لمحہ رسالت کی عظیم ذمہ داری کے حوالے سے مشکوک رہے ہوں۔

غارِ حرا سے واپسی پر سرکار دوعالم ﷺ کی کیفیات کا تذکرہ خود راویوں کی زبانی سنیے تاکہ عدل و انصاف کے آئینے میں مصنفہ کے لگائے گئے اتہام کی حقیقت کی قلعی کھل سکے۔

”وَ رَجَعَ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ يَرْجِفُ فُؤَادُهٗ وَدَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ بِنْتِ خُوَيْلَدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا فَقَالَ زَمِّلُوْنِيْ، زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ لِخَدِيْجَةَ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحْمَ، تَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ“ (۱)

”پس آیاتِ الٰہیہ کو سینے میں محفوظ کیے ہوئے رسول اللہ ﷺ اپنی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے تو آپ پر کپکپی طاری تھی۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اوڑھاؤ، مجھے اوڑھاؤ، تو انہوں نے آپ پر چادر ڈال دی یہاں تک کہ خوف و ہراس دور ہو گیا۔ پھر آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ساری تفصیل سنا دی اور فرمایا کہ مجھے اپنے بارے میں ڈر لگ

۱۔ بخاری، ج:۱، ص:۹۴

رہا ہے۔ یہ سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہر گز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی بھی بے آبرو نہیں کرے گا کہ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، کم زوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مفلسوں کی دستگیری کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور حق کے حوالے سے دست تعاون دراز کرتے ہیں۔"

ہو سکے تو مندرجہ بالا عبارت از سر نو پڑھ لیجیے اور ڈھونڈیے! کیا ایسا کوئی اشارہ نظر آتا ہے کہ جس سے یہ ثابت کیا جا سکے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حوالے سے مشکوک تھے؟ غضب ہو گیا کہ جو بات شاید کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ ہو، اسے کس طرح عین حقیقت بنانے کی ناپاک جسارت کی جا رہی ہے۔ مندرجہ بالا عبارت سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ آپ فکر مند تھے، لیکن اس سے یہ قطعی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ معاذ اللہ آپ اپنے نبی ہونے کے حوالے سے مشکوک تھے۔ اب رہ گئی یہ بات کہ آپ کی تشویش کس حوالے سے تھی؟ علمائے کرام نے اس کی بڑی ہی حقیقت پسندانہ توجیہ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی جلالت شان کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ پہاڑ پر نازل ہو تو وہ خشیت الٰہی سے ریزہ ریزہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ"(۱)

"اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو آپ یقینی طور پر اسے خوف الٰہی سے خم اور پاش پاش ہوتا ہوا دیکھتے۔"

اب غور کیجیے کہ جب یہ کلام پاک مصطفےٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل ہو تو نبوت کے بار گراں کی وجہ سے وہ لرز لرز جائے تو حیرت کیوں؟ یہی وجہ ہے علامہ بدر الدین عینی لکھتے ہیں کہ

۱- القرآن الکریم، سورہ:۵۹، آیت:۲۱

''خَافَ اَنْ لَّا یَقْوِیْ عَلٰی مُقَاوَمَۃِ ھٰذَا الْاَمْرِ وَلَا یُطِیْقُ حَمْلَ اَعْبَاءِ الْوَحْیِ ''(۱)

''حضور کو اس بات پر اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اس امر عظیم کی ذمہ داریوں کو کماحقہ پورا نہ کرسکیں اور وحی کے اس بارگراں کے متحمل نہ ہوسکیں گے۔''

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چینی اور تشویش کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ خود اپنے نبی ہونے کے حوالے سے مشکوک تھے، بلکہ اتنی عظیم ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے حوالے سے آپ فکر مند ہوگئے تھے۔ اسے ایک عام سی مثال کے ذریعہ یوں سمجھیں کہ کسی کو کوئی منصب عطا کیا جائے اور وہ وقتی طور پر فکر مند ہو جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اسے منصب مذکور پر فائز ہونے کے حوالے سے شک ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اسے ذمہ داریوں کے احساس نے تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔

اسی کے ساتھ واقعات کا یہ حصہ بھی پیش نگار ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے لگاتار تین بار گزارش کی کہ ''پڑھیے'' اور آپ نے تینوں بار انکار کردیا، لیکن جب چوتھی بار انہوں نے کہا کہ ''اپنے رب کے نام سے پڑھیے'' تو آپ نے وحی الٰہی کو دہرایا۔ یعنی جب تک انہوں نے رب کریم کا حوالہ نہ دیا، آپ نے نہ پڑھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنے کی گزارش کرنے والے کو بھی یہ معلوم تھا کہ مخاطب رب کریم سے واقف ہیں اور پڑھنے والے بھی رب کریم سے بے خبر نہیں تھے۔ اور یہ بات کہنے کی نہیں کہ ایسے دور میں جب کہ خدائے وحدہ لاشریک کی معرفت کا کوئی ذریعہ بہ ظاہر موجود نہ ہو، لیکن اس کے باوجود جو اپنے پالنہار حقیقی سے واقف ہو، وہ اگر اپنے اس تعلق کا بھی حقیقی ادراک رکھتا ہو، جو ایک نبی کو خدا سے ہوتا ہے، تو اس میں حیرت و استعجاب کیوں؟

۱- عمدۃ القاری، ج:۱، ص:۳۶، دار الفکر

عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

کیرن آرم اسٹرانگ نے زیرِ نظر کتاب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے پہلے کا تذکرہ کچھ اس ڈھنگ سے کیا ہے کہ جیسے وہ ایک عام سے انسان تھے، نہ معاشرہ میں ان کی کوئی امتیازی شان تھی اور نہ ہی انہیں کوئی وقار حاصل تھا۔ اس فکر کے پس منظر کا سراغ لگائیں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موصوفہ چاہتی یہ ہیں کہ ان پر ایمان لانے کے باوجود لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے الفت و محبت کے حوالے سے کوئی جذباتی تعلق نہ قائم ہو سکے۔ زہر میں بجھے ہوئے قلم کا تیور ملاحظہ کیجیے:

"Nobody would take him seriously, because, despite his marriage to Khadijah, he had no real status in the city."(1)

''حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے باوجود کوئی انہیں سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا کیوں کہ شہر میں ان کی کوئی واقعی حیثیت نہ تھی۔'' (معاذ اللہ)

مندرجہ بالا جملہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی ناقابل قبول ہے، بلکہ اسے تو عدل و انصاف کی رفاقت میں تاریخ کا مطالعہ کرنے والے غیر مسلم بھی ہضم نہیں کر سکتے کہ اعلان نبوت سے قبل سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب زندگی کے جو اوراق دست یاب ہیں ان میں یہ صداقت دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہے کہ انہیں

۱۔ زیرِ بحث کتاب، ص: ۳۹

معاشرہ میں نہ صرف وقار حاصل تھا، بلکہ وہ امانت دار، راست باز اور عفت مآب سمجھے جاتے تھے۔ اس حوالے سے تاریخ کے چند واقعات ملاحظہ فرمایئے تا کہ موصوفہ کے قلم سے نکلی ہوئی مندرجہ بالا عبارت کی حقیقت واضح ہو سکے۔

حجر اسود کی تنصیب:

سرکار دو عالم ﷺ اپنی عمر کے پینتیس ویں سال میں تھے کہ اہل مکہ نے کعبہ مشرفہ کی تعمیر جدید کا آغاز کیا۔ لوگ بڑے جوش و جذبے کے ساتھ تعمیر کے مرحلے میں ساتھ ساتھ تھے۔ آپ ﷺ بھی سبھوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر اس کار خیر میں شریک تھے۔ کام بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، لیکن جب حجر اسود کو نصب کرنے کا وقت آیا تو جاہلی عصبیت کے سوئے ہوئے فتنے انگڑائی لینے لگے۔ ہر قبیلہ حجر اسود کی تنصیب کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دینے کو تیار تھا۔ بنو عبد الدار نے اپنے قبیلہ کے ذی اثر افراد کو جمع کیا اور سبھوں سے یہ عہد لے لیا گیا کہ اگر انہیں یہ شرف میسر نہیں آتا تو وہ شمشیر بے نیام کے سہارے اسے حاصل کر کے رہیں گے۔ اس عہد و پیمان کی پختگی کے لیے جاہلیت کے رسم و رواج کے مطابق ایک پیالہ خون سے بھرا ہوا مجلس میں لایا گیا اور سبھوں نے اپنی اپنی انگلیاں ڈبو کر وعدہ وفا کرنے کا حلف لیا۔ چار پانچ دنوں تک یہی کشمکش ہوتی رہی۔ ایک دن اسی نزاع کے تصفیہ کے لیے ایک مجلس جمی تھی کہ اتنے میں ابو امیہ بن مغیرہ کھڑا ہوا اور اس نے کہا:

”یا معشر قریش: اجعلو بینکم فیما تختلفون فیہ، اول من یدخل من باب ھذا المسجد یقضی بینکم فیہ ....ففعلوا“(۱)

”اے گروہِ قریش! جس معاملہ میں تمہارے درمیان اختلاف ہے، اس

۱- السیرۃ النبویہ: ابن کثیر، ج:۱، ص:۲۸۰

کے تصفیہ کے لیے اسے حکم مقرر کرلو جوکل سب سے پہلے اس مسجد کے دروازے سے داخل ہو............اس بات پر سب متفق ہو گئے۔"

اس کے بعد مجلس برخاست ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب لوٹ گئے۔ دوسری صبح سب سے پہلے سرکار دوعالم ﷺ مسجد کے دروازے سے داخل ہوئے۔ یہ دیکھتے ہی لوگ فرط مسرت سے چیخ پڑے اور کہنے لگے:

"ھذا الامین رضینا به حکما ھذا محمد "(۱)

یعنی یہ محمد ہیں، ہم سب ان کے فیصلے سے راضی ہیں کہ یہ امین ہیں۔

یہ جملہ بتا رہا ہے کہ اعلان نبوت سے قبل سرکار دوعالم ﷺ اپنے شہر میں کس حیثیت سے پہچانے جاتے تھے اور عین نوجوانی کے عالم میں بھی شہر کے عمر رسیدہ رؤسائے قبائل کے درمیان آپ کا مقام کیا تھا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ نے اس نزاعی مسئلہ کا ایسا حل پیش کیا، جسے سبھوں نے کھلے دل کے ساتھ قبول کرلیا۔ آپ نے ایک چادر منگوائی اور حجر اسود کو درمیان میں رکھتے ہوئے قبائل کے سرداروں کو دعوت دی کہ وہ سب مل کر چادر کے کونے پکڑ لیں۔ آپ کے مشورے کے مطابق اسے اٹھایا گیا اور سب مل کر اسے لیکر آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ حجر اسود اپنے مقام نصب تک پہنچ گیا۔ سرکار دوعالم ﷺ آگے بڑھے اور اسے اپنے دست مبارک سے نصب کردیا۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ نزاع صرف دو قبائل کے درمیان نہیں ہے، بلکہ سارے قبائل آپس میں دست بہ گریباں ہیں۔ ایسے کشیدہ ماحول میں سرکار دوعالم ﷺ کو بے چون وچرا اپنے لیے منصف کی حیثیت سے قبول کرلینا کوئی عام بات نہیں اور وہ بھی ایسے معاشرے میں جہاں چھوٹی چھوٹی باتوں میں قتل وخون کے معرکے

۱- سیرت ابن ہشام ج:۱، ص:۲۱۳

خاندانی وجاہت وسر بلندی کا حصہ سمجھے جاتے ہوں۔ عقل وانصاف کی روشنی میں دیکھا جائے تو تنہا یہی ایک واقعہ معاشرے میں سرکار ابد قرار ﷺ کے وقار وعظمت کی گواہی کے لیے بہت کافی ہے۔

حلف الفضول کے نفاذ میں کردار:

زمانہ جاہلیت میں یمن کا ایک تاجر اپنے سامان تجارت کے ساتھ مکہ آیا۔ عاص بن وائل نامی رئیس مکہ نے اس سے سامان خرید تو لیا، لیکن قیمت دینے سے انکار کر بیٹھا۔ تاجر اس سلوک سے بڑا ہی افسردہ ہوا اور عاص بن وائل کے دوست قبائل سے جا کر اس زیادتی پر شکوہ کیا اور مدد کی درخواست بھی کی۔ لیکن سبھوں نے ایک نووارد کے لیے خود اپنے حلیف قبائل سے تعلقات کشیدہ کرنا مناسب نہ جانا۔ اسی دوران ایک دن جب کہ قریش کے سردار حرم کعبہ کے صحن میں اپنی مجلس جمائے بیٹھے تھے، وہ تاجر آدھمکا اور قریب کی ایک پہاڑی پر چڑھ کر اپنی داستان رو رو کر سنانے لگا۔ زبیر بن عبد المطلب کو اس اجنبی تاجر پر رحم آ گیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو غیرت دلائی اور انہیں مظلوم کی داد رسی پر ابھارا۔ چناں چہ عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک نشست رکھی گئی، جس میں قبائل کے سردار شریک ہوئے۔ دیر تک گفت وشنید کے بعد سب اس بات پر متفق ہوئے کہ اب کسی بھی ظالم کا ظلم برداشت نہیں کیا جائے گا اور ہم سب مشترکہ طور پر اس جدوجہد میں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ رہیں گے۔ چوں کہ جن تین افراد نے اس معاہدہ کو تحریری شکل دی، ان سب کے ناموں کا آغاز ''فضل'' سے ہوتا تھا، اس لیے اس معاہدے کا نام ''حلف الفضول'' پڑ گیا۔(۱)

بلا شک وشبہہ اس معاہدے پر عرصے تک عمل ہوتا رہا اور مکہ کے اطراف و

۱- دیکھیے: الروض الانف، ج:۱، ص:۱۵۶

جوانب میں عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق مظلوم کی دادرسی کی جاتی رہی۔ لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے جذبات سرد پڑ گئے اور دھیرے دھیرے یہ معاہدہ بھی عملی طور پر دم توڑ گیا۔

اسی دوران ایک مرتبہ ایک بدو فریضہ حج ادا کرنے کی غرض سے مکہ آیا۔ اس کے ساتھ اس کی زہرہ جمال بیٹی بھی تھی۔ مکہ کے ایک تاجر کی نگاہ جوں ہی اس کی خوب صورت بیٹی پر پڑی اس نے اسے اپنے قبضہ میں کرنے کی ٹھان لی اور جلد ہی اسے اِغوا کروالیا۔ باپ کے حواس گم ہو گئے۔ وہ حیران و پریشان مکے کی گلیوں میں صدائے مدد لگاتا پھرتا۔ شدہ شدہ یہ افسوس ناک خبر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگئی۔ آپ کو یارائے ضبط نہ رہا اور مظلوم کی دادرسی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ قریش کے نوجوانوں کے جذبات بیدار کیے اور ان کے ساتھ کعبہ شریف کے سامنے حلف لیا گیا کہ وہ مظلوموں کی حمایت و نصرت کریں گے اور اس حوالے سے امیر وغریب میں کوئی امتیاز نہیں کریں گے۔ اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے آب زم زم سے حجر اسود کو دھل کر اس کا غسالہ سبھوں نے پیا۔

معاہدے کے بعد اس کے اجرا کی سب سے پہلی منزل سامنے تھی۔ اس اجنبی کی جواں سال بیٹی اب تک اسی تاجر کے غاصبانہ قبضے میں تھی، لہٰذا نوتشکیل شدہ جماعت کے رضا کاروں کا رخ اسی کے دولت کدے کی جانب تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں نوجوانوں نے اس کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اسے بے چون وچرا لڑکی کو آزاد کرنا پڑا۔

رومانیہ کے وزیر خارجہ کونستانس جیورجو نے اپنی کتاب میں یہ اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ یہ علامتی طور پر تو اسی حلف الفضول کی تجدید تھی، لیکن نتائج کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق تھا۔ ماضی بعید میں کیے جانے والے حلف الفضول کے نفاذ کو یقینی

بنانے کے لیے کوئی ٹیم نہیں بنائی گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کے مثبت اثرات دیر پا ثابت نہ ہو سکے، لیکن جو معاہدہ سرکار دو عالم ﷺ کی سرپرستی میں ہوا، اس پر عمل کو یقینی بنانے کے لیے مکہ میں نوجوانوں کی ایک ٹیم تیار تھی، جو مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔(۱)

عدل و انصاف کے ساتھ اس واقعے کے پس منظر پر نگاہ ڈالیں! سرکار دو عالم ﷺ کی سرپرستی میں مکہ مکرمہ کے نوجوانوں کا ظلم و ستم کے خلاف متحد ہو کر لڑنے کا عزم مصمم اور عہد و پیمان .... کیا یہ سمجھنے کے لیے کافی نہیں کہ مکہ کے نوجوانوں کے درمیان سرکار دو عالم ﷺ کی شخصیت کس مقام و مرتبت پر فائز تھی؟ کہنے دیا جائے کہ دنیا کسی کی قیادت اس وقت تک قبول نہیں کرتی، جب تک کہ شخصیت کی عظمت و بزرگی، کردار کی بلندی و شرافت اور اس کے صاف ستھرے معاملات کی دل سے قائل نہ ہو جائے۔

مکہ مکرمہ کے تحفظ کے لیے پیش قدمی:

جسٹس امیر علی نے اپنی کتاب میں ایک واقعہ بڑے شرح و بسط کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل مکہ کے چند ذی ہوش اور عقل و فراست کے مالک افراد بتوں کی پرستش کے حوالے سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ دوران گفتگو سبھوں نے اسے افسوس ناک قرار دیا کہ لوگ اپنے ہاتھوں سے بت تراشیں اور پھر اسی کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہم سب اپنی بساط کے مطابق تلاش حق کی کوشش کرتے۔ یہ بات سبھوں کو اچھی لگی اور انہوں نے طے کیا کہ ہم سب پڑوس کے ملکوں میں جائیں گے تاکہ کہیں سے ہمیں حقیقت کا سراغ لگ

۱- دیکھیے، نظرة جديدة في سيرة رسول الله: مترجم پروفیسر محمد التونجی، ص:۳۹

سکے۔ اس جماعت میں ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن حویرث اور زید بن عمرو کے نام خصوصیت کے ساتھ مشہور و معروف ہیں۔ تاریخ اسلامی میں اس جماعت کو "حنفا" کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ عثمان بن حویرث نے قسطنطنیہ کا سفر کیا اور کسی طرح قیصر روم کے دربار تک رسائی حاصل کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور بادشاہ کے مقربین خاص میں شمار کیا جانے لگا۔ جب بادشاہ کو یہ یقین ہو گیا کہ عثمان نہ صرف ہمارا ہم مذہب ہو گیا ہے، بلکہ فکری سطح پر بھی اس کے خیالات پوری طرح عیسائیت سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں، تو اس نے عرب پر اپنا تسلط جمانے کے لیے عثمان کو اپنے آلۂ کار کی حیثیت سے تربیت دینی شروع کر دی۔ اس منصوبے کے لیے بادشاہ نے سب سے پہلے مکہ مکرمہ کا انتخاب کیا، کیوں کہ خانہ کعبہ کے وجود کی وجہ سے سارے عرب میں مکہ مکرمہ کو امتیازی شان حاصل تھی۔ بادشاہ کے خیال میں اگر کسی طور مکہ مکرمہ پر قبضہ کر لیا جائے تو اطراف وجوانب کے عرب علاقے بہت آسانی کے ساتھ فتح کر لیے جائیں گے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قیصر روم نے عثمان کو خاطر خواہ داد و دہش کے ساتھ مکہ روانہ کر دیا۔ یہاں پہنچ کر عثمان بڑی عیاری کے ساتھ لوگوں کی قربت حاصل کرتا اور انہیں مالی معاونت کے جال میں پھنسا کر اپنا ہم خیال بناتا۔ رفتہ رفتہ یہ خبر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچی۔ آپ نے بروقت اقدام کرتے ہوئے اہل عرب کی غیرت کو للکارا اور قیصر روم کی سازش کو بے نقاب کر دیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دور اندیشی سے اس سازش کے مضر اثرات کو محسوس کرتے ہوئے عرب کو نہ جگایا ہوتا تو، مکہ مکرمہ قیصر روم کی دست درازی سے محفوظ نہ رہ پاتا۔ (۱)

ذرا غور کریں کہ اپنے شہر کو غیروں کے تصرف سے بچانے کے لیے مؤثر راہیں

۱- سیرت النبی: جسٹس امیر علی، ص: ۳۱

تلاش کرنا کیا کسی ایسے ویسے کے بس میں ہے؟ یہ تاریخی حقیقت چیخ رہی ہے کہ آقائے کائنات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان نبوت سے قبل بھی اپنے شہر میں قدر و منزلت اور شرف و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، لیکن وہی بات کہ اگر کوئی دانستہ طور پر دوپہر کی دھوپ میں اپنی آنکھیں بند کرلے اور سورج کے وجود کا ہی انکار کر بیٹھے تو ایسے دیوانے کے کہنے سے دن کی روشنی ظلمت و تاریکی سے بدل نہیں جائے گی۔

×××

جذبۂ تنقیص کے پہلو میں توصیف

جو لوگ مستشرقین کے اسلوب نگارش سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ بہ حالت مجبوری کبھی کبھی کسی شخصیت کی تعریف و توصیف ضرور کرتے ہیں، لیکن کہیں نہ کہیں درمیان میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں، جس سے قاری کے لاشعور میں زیر بحث شخصیت کے حوالے سے عظمت و افتخار، شرف و بزرگی اور فضائل و کمالات کا اٹھتا ہوا مرغولہ اچانک زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح نہ تاریخی حقیقتوں سے اعراض کرنے کا الزام ان کے سر آتا ہے اور نہ ہی اظہار حقیقت کے نتیجے میں کوئی مثبت فائدہ ہی شخصیت کو پہنچ پاتا ہے۔

اس پس منظر میں زیر بحث کتاب کی مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ کے قلم سے تحریر شدہ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"The young Muhammad was well-liked in Mecca. He was handsome, with a compact, solid body of average height. His hair and beard were thick and curly, and he had a strikingly luminous expression and a smile of enormous charm, which is mentioned in

all the sources............ He inspired such confidence that he was known as al-Amin, the Reliable One. But his orphand status constantly held him back."(۱)

''نوجوان محمد (ﷺ) کو مکہ میں مقبولیت حاصل تھی۔ آپ خوب صورت، حسین وجمیل اور متناسب قد وقامت کے تھے۔ آپ کی داڑھی اور بال گھنے اور گھنگرالے تھے، نیز اثر انداز ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ پرکشش شخصیت کے مالک تھے کہ جن کا تذکرہ کثرت کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے.........آپ نے حسن اخلاق کی وجہ سے وہ اعتماد حاصل کرلیا تھا کہ لوگ 'الامین' کے لقب سے یاد کرنے لگے، لیکن یتیمی کا داغ آپ کو مستقل پیچھے دھکیل دیا کرتا تھا۔''

دیکھ رہے ہیں آپ! اس میں شک نہیں کہ کیرن آرمسٹرانگ نے نہایت ہی خوب صورت اور پرکشش لب ولہجے میں سرور کائنات ﷺ کے سراپائے حسن وجمال اور اخلاق وکردار کی حسین تصویر کھینچی ہے، لیکن اخیر میں ایسے جملے کا پیوند لگا دیا کہ جس سے سابقہ تعبیرات وکلمات کی ساری رعنائیاں دھندلی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

اسے کہتے ہیں حسین تعبیرات کے گلدستے میں چھپی ہوئی پراگندہ فکر ونظر کی جھلک کہ جس کی تیرہ وتاریک پرچھائیوں میں ایک سنجیدہ قاری کی فکری صلاحیتیں گم ہوجاتی ہیں اور جب مضمون ختم ہوتا ہے، تو شخصیت کے ساتھ الفت ومحبت کے پاکیزہ جذبات کا کوئی اثر وہ اپنے اندر محسوس نہیں کرتا۔ اور یہی نتیجہ مستشرقین کے طرز اسلوب میں بہت بڑی کام یابی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۳۷

اپنی اس فکری کجی کو مدلل کرنے کے لیے موصوفہ نے ایک واقعہ بھی لکھا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے سے پہلے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے ان کی بیٹی فاختہ سے نکاح کی خواہش کا اظہار کیا تھا، جسے ابو طالب نے خوب صورتی کے ساتھ نامنظور کر دیا۔ اس انکار کی وجہ بیان کرتے ہوئے موصوفہ رقم طراز ہیں کہ

"He had wanted to marry his cousin Fakhitah, but Abu Talib had to refuse his request for her hand, gently pointing out that Muhammad could not afford to support a wife, and made a more advantageous match for her."(۱)

''انہوں (سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی کزن فاختہ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، لیکن ابو طالب نے ان کی درخواست یہ کہتے ہوئے مسترد کر دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک بیوی کی ذمہ داری نبھا نہیں پائیں گے اور اپنی بیٹی کے لیے نسبتاً ایک بہتر رشتے کو منظوری دے دی۔''

کچھ عرض کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم تاریخی اعتبار سے مندرجہ بالا واقعہ کی تفصیلات قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں تا کہ گفتگو ہر زاویہ سے صاف ہو جائے۔
محترمہ فاختہ وہی خاتون ہیں، جو تاریخ اسلامی میں ام ہانی کے نام سے شہرت رکھتی ہیں۔ ان کا نام خصوصیت کے ساتھ قصہ اسراء و معراج میں لیا جاتا ہے، کیوں کہ شب معراج سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کے گھر آرام فرماتے تھے اور اس مقدس سفر کا آغاز یہیں

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۳۷

سے ہوا تھا۔ تاریخی کتب میں ابو طالب کی اولاد شمار کرتے ہوئے مؤرخین نے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کا ذکر بھی کیا ہے۔

"ولد ابو طالب طالبا وبه كان يكنى وهو اكبر ولده و عقيلا و جعفرا و عليا و ام هانى و اسمها هند و قيل فاخته و جماعة......"(۱)

"ابو طالب کے ایک صاجزادے طالب ہوئے جو کہ سب سے بڑے تھے، جن سے ان کی کنیت منسوب ہے، اس کے بعد عقیل، جعفر، علی اور ام ہانی ہیں جن کا نام ہند ہے، انہیں فاختہ اور جماعۃ سے بھی یاد کیا جاتا رہا ہے......"

اب اس واقعہ کی بنیاد کے لیے علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور زمانہ کتاب اصابہ دیکھیے، وہ لکھتے ہیں:

"خطب النبى صلى الله عليه وسلم الى ابى طالب ام هانى و خطبها منه هبيرة، فزوج هبيرة، فعاتبه النبى صلى الله عليه وسلم، فقال ابو طالب: يا بن اخى! انا قد صاهرنا اليهم و الكريم يكافئ الكريم......"(۲)

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب سے اپنے لیے ام ہانی کا ہاتھ مانگا جب کہ ہبیرہ نے بھی ان سے رشتہ چاہا تھا، انہوں نے ہبیرہ سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس بارے میں اپنے چچا سے شکوہ کیا، تو وہ کہنے لگے کہ ہم نے ہبیرہ کے ساتھ ان کا رشتہ طے کر رکھا تھا

۱- الجوہرۃ فی نسب الرسول، باب ابو طالب

۲- اصابہ، ج:۸، ص:۲۸۵

اور اچھے انسان کے ساتھ کیا ہوا وعدہ اچھا انسان ہی پورا کرتا ہے........"

ملاحظہ کر رہے ہیں! خاندان کی آپسی گفتگو سے وہ مفہوم نکالے جا رہے ہیں کہ جن سے شخصیت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزگی وطہارت کو دھندلایا جا سکے۔ جب ابوطالب اپنے انکار کی توجیہ خود ہی کر رہے ہیں، تو پھر اپنی طرف سے اسے دوسرا مفہوم دے کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یتیمی کو نشانہ بنانا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ مصنفہ نے اپنی فکری آوارگی کے لیے کوئی حوالہ بھی نہیں دیا ہے کہ جس کا تعاقب کیا جا سکے۔ بہ ہر حال مجھے یقین ہے کہ مصنفہ نے جس عبارت کو اپنی زیر بحث گفتگو کے لیے بنیاد بنایا ہے، وہ یہی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مندرجہ بالا واقعہ میں ذکر ہونے والے کلمہ "یکافئ" کا ترجمہ "کفو" نہ کر لیا جائے کہ جس سے مفہوم کچھ اس طرح ہو جائے کہ "اچھا انسان ہی اچھے انسان کا کفو ہوتا ہے"، بہ الفاظ دیگر یہ کہ معاذ اللہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے کفو نہیں ہیں۔ یہ مفہوم کسی طور درست نہیں ہو سکتا کہ نسب کے اعتبار سے تو دونوں ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور پھر اگر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری طور پر مالدار نظر نہیں آتے، تو حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا ہی کہاں صاحبہ ثروت کہلائی جاتی تھیں؟ لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ابوطالب نے دوران گفتگو جو ترکیب استعمال کی ہے، وہ دونوں کے ایک دوسرے کے لیے کفو ہونے نہ ہونے کے حوالے سے نہیں ہے، بلکہ اس حقیقت کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ ابوطالب نے پہلے ہی اپنی صاحب زادی کے لیے کسی کو زبان دے رکھی ہے اور ایفائے وعدہ کرنا ایک اچھے انسان کے لیے ازبس ضروری ہے۔

ویسے اگر تاریخی دستاویز کا سراغ لگایا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ابوطالب کی معاشی حالت بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ اس حوالے سے وہ واقعہ بہترین

استدلال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، جب سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے چچا کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس واقعہ کی تمہید یہ ہے کہ ایک بار اہل مکہ شدید قحط سالی کا شکار ہو گئے۔ چوں کہ ابو طالب پہلے ہی سے کثیر العیال تھے اور اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں معاشی طور پر مستحکم نہ تھے، اس لیے اس حادثے نے ان کی کمر توڑ دی۔ اپنے چچا کی تنگ حالی مونس و غم خوار بھتیجے سرکار دو عالم ﷺ سے دیکھی نہ گئی اور ایک روز آپ اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ معمول کے ابتدائیہ کلمات کے بعد ان کے سامنے اپنے چچا ابو طالب کی تنگ دستی کا تذکرہ کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمیں موجودہ جاں گسل حالات میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔ دوران گفتگو کہنے لگے کہ اس حوالے سے بہتر ہوتا کہ ہم ان کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری آپس میں تقسیم کر لیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسے پسند کیا اور طے شدہ منصوبے کے تحت دونوں ابو طالب کے پاس گئے اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھی۔ ابو طالب نے اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عقیل اور طالب کو میرے پاس چھوڑ دو اور باقی دو بیٹے جعفر اور علی کے بارے میں تم جس طرح چاہو فیصلے کر لو۔ چناں چہ آپ نے کم سن علی رضی اللہ عنہ کو اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔(۱)

اس وضاحت کے بعد یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ جب ابو طالب خود ہی معاشی زبوں حالی کا شکار رہے ہوں تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی صاحبزادی کے رشتے کے لیے اپنے بھتیجے سے یہ کہہ دیں کہ تم اس کے کفو نہیں ہو؟ منطقی طور پر یہ بات اس وقت درست ہو سکتی تھی، جب کہ کوئی شخص اپنی بے پایاں دولت و سرمایہ کے سائے میں پروان چڑھی ہوئی شہزادی کے لیے رشتہ تلاش کر رہا ہوتا۔

۱۔ دیکھیے، سیرت ابن ہشام، ج:۱، ص:۲۴۶

یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ حضرت عبد المطلب کے وصال کے بعد ابوطالب نے جس محبت وشفقت کے ساتھ سرکار دوعالم ﷺ کی کفالت کا حق ادا کیا ہے، وہ انداز ہمایونی شہادت دے رہا ہے کہ آپ کے لیے ابوطالب کے دل میں کس طرح کے جذبات موجزن تھے۔ کہتے ہیں کہ ابو طالب کے بیٹھنے کے لیے خوب صورت گدا بچھایا جاتا تھا۔ جب سرکار دوعالم ﷺ تشریف لے جاتے تو بلا جھجک گدے پر بیٹھ جاتے۔ یہ دیکھ کر ابوطالب کہتے:

"انك لمبارك"(۱)

"آپ خیر و برکت کا سر چشمہ ہیں۔"

یہ بات بھی تاریخ میں موجود ہے کہ ابوطالب ہمیشہ اپنے پیارے بھتیجے کو ساتھ ساتھ رکھتے تھے، کھانے کے وقت ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے، سونے کے دوران اپنے پہلو میں لٹاتے۔ کبھی دستر خوان چنے جانے کے بعد آپ نظر نہ آتے تو اپنے کسی بیٹے کو بلانے کے لیے بھیجتے۔ پھر آپ کے آنے کے بعد ہی کھانا تناول کیا جاتا۔ یہ بھی تاریخ کے صفحات میں موجود ہے کہ اگر کبھی ابوطالب کے بچے آپ کے بغیر کھانا کھاتے تو وہ سب کے لیے کافی نہ ہو پاتا، لیکن جب آپ موجود ہوتے تو سب شکم سیر ہو جاتے۔ اپنے بھتیجے کی شرکت پر ہونے والے خیر و برکت سے متاثر ہو کر کہتے کہ "انك لمبارك۔"

کہتے ہیں آپ کی کم سنی کے ایام میں ایک بار مکہ شدید قحط سالی کا شکار ہو گیا۔ لوگ قطرہ آب کے لیے ترس گئے۔ فصلیں تباہی کے دہانے پر پہنچ گئیں اور مویشی پیاس کی شدت سے نڈھال ہو گئے۔ ان مشکل ترین حالات میں کسی نے اہل مکہ سے فہمائش کرتے ہوئے کہا کہ چلو لات وعزی کے پاس چلتے ہیں اور وہاں جا کر فریاد

۱- سیرت النبوۃ: زینی دحلان، ص: ۸۸

کریں گے۔ اسی دوران ایک شخص نمودار ہوا اور اس نے رائے دی کہ تم کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو جب کہ تمہارے درمیان حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی حسین یادگار موجود ہے۔ اس نے کہا تمہارا اشارہ ابو طالب کی طرف ہے۔ اس نے کہا بلاشبہ۔ یہ سنتے ہی لوگ ابو طالب کے دولت کدے کی جانب دوڑ پڑے۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور فریاد کی کہ وہ بارش کے لیے دعا کریں۔ ابو طالب سرکار دو عالم ﷺ کا ہاتھ تھامے باہر نکلے اور کعبہ مقدسہ پہنچ کر انہیں دیوار کعبہ کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس وقت آسمان پر بادل کا نام ونشان نہ تھا، لیکن جوں ہی لب مبارک ہلے، آسمان کے طول وعرض میں پھرتے ہوئے آوارہ بادل دھیرے دھیرے اکھٹے ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھنگھور گھٹا چھا گئی۔ چند لمحوں کے اندر ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی کہ اطراف و جوانب جل تھل ہو گئے۔ اس حیرت انگیز واقعہ کے چشم دید گواہ خود ابو طالب تھے، اس لیے اعلان نبوت مصطفےٰ ﷺ کے بعد جب اہل مکہ نے سرکار دو عالم ﷺ کو اذیت پہنچانے کا ارادہ کیا، تو ابو طالب نے بڑے ہی رقت انگیز لب ولہجے میں اہل مکہ پر سرکار دو عالم ﷺ کا وہ احسان یاد دلایا، جب کہ لوگ ایک ایک قطرہ آب کے لیے ترس رہے تھے اور رب ذوالجلال نے ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھ لی۔ جناب ابو طالب کے کہے ہوئے اشعار میں سے چند سماعت فرمائیں:

و ابیض یستسقٰی الغمامُ بوجهه

ثمال الیتٰمٰی و عصمة للاراملِ

"وہ منور و مجلی رنگت والے کہ جن کے عارض تاباں کے وسیلے سے بارش کی بھیک مانگی جاتی ہے، وہ یتیموں کے پناہ گاہ اور بیواؤں کی عصمت کے محافظ ہیں۔"

يلوذ به الهلاك من ال هاشم

فهم عنده في نعمة و فواضل (۱)

''خاندان بنی ہاشم کے لوگ ہلاکت سے بچنے کے لیے آپ کی پناہ میں آگئے، بلاشبہ لوگ ان کے ذریعہ احسانات وانعامات سے مالا مال کردیے جاتے ہیں۔''

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ ابو طالب کے دل میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کس قدر شفقت ومحبت کے جذبات تھے؟ اس قربت وشفقت اور انس ومحبت کے بعد یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی بیٹی کے رشتے سے صرف اس لیے انکار کردیا ہو کہ آپ بہ ظاہر صاحب ثروت نہ ہوں، جب کہ قرائن یہ بتارہے ہیں کہ ابو طالب کے نزدیک مال ودولت کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ وہ تو بلند اخلاق وکرار، حسن تدبر وتفکر اور عفت مآبی کو کہیں زیادہ پسند کرتے تھے۔ میری اس رائے کی تائید کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی کے موقع پر ابو طالب کے ذریعہ دیے گئے عربی خطبہ کے یہ الفاظ پڑھیے:

''....... ان ابن اخی هذا محمد ابن عبدالله (صلی اللہ علیہ وسلم) لا یوزن بوجل الا رجح به وان کا ن فی المال قُلاو ان المال ظل زائل وامر حائل ......''(۲)

''........ بلاشبہ میرے اس بھتیجے محمد بن عبداللہ کا موازنہ دنیا کے جس شخص سے بھی کیا جائے تو یقینی طور پر بھی بھاری رہیں گے۔ اگر یہ صاحب ثروت نہیں ہیں تو کیا ہوا کہ مال تو ایک ڈھلنے والے سائے اور

۱- دیکھیے، سیرت ابن ہشام، ج:۲، ص:۱۶

۲- الوفا بحر یب المصطفیٰ: شیخ عبدالرحمن بن جوزی، باب الخامس والاربعون

تبدیل ہو جانے والے لمحے کی طرح ہے.....''

بارِ خاطر نہ ہو تو ازراہ کرم مندرجہ بالا کلمات کے ایک ایک حرف پر غور کریں۔ ہر حرف کے زاویے چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ابو طالب ان لوگوں میں سے نہ تھے، جنہیں اخلاق و کردار، عزو شرف اور خصال حمیدہ سے زیادہ مال و دولت کی فراوانی عزیز ہو، بلکہ انہوں نے تو منطقی طریقہ استدلال سے یہ ثابت بھی کر دیا کہ نگاہوں کو خیرہ کرنے والی دولت و ثروت کی بہاریں پائیدار نہیں ہوا کرتیں۔ اور تمثیل بھی ایک ایسی چیز سے دی جس کے زوال کی تیزی سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ اس کے برعکس اخلاق و کردار کی بلندی وہ دولت بے بہا ہے کہ جو ہمہ وقت انسان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور سچے ساتھی ہونے کا حق ادا کرتی ہے۔

×××

آیات کی خودساختہ تعبیر

اس بات کی اہمیت سے انکار نہیں کہ کسی شخصیت پر قلم اٹھانے کے لیے ایک قلم کار کو حد درجہ غیر جانب دار ہونا چاہیے، کیوں کہ یا تو وہ مثبت جانب داری کے ساتھ اپنے ممدوح کی شان میں پذیرائی کے لیے بے بنیاد جلوے گڑھ لے گا، یا پھر منفی جانب داری کی رو میں بہتے ہوئے وہ شخصیت کی واقعی حیثیت کو بے وقعت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح دونوں پیمانے ایک قاری کو عدل وانصاف اور حقائق ومسلمات سے بہت دور کردیں گے۔

ہم جب، اس تسلیم شدہ حقیقت کے پس منظر میں زیر بحث کتاب کی مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ کو دیکھتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ وہ بعض مقامات پر آیات قرآنیہ کے مفاہیم کی تعیین میں بھی فکری تعصب اور ذہنی منافرت سے اپنے دامن کو بچا نہ سکیں۔ مثال کے لیے مندرجہ ذیل عبارت پر غور کریں:

" In the Qur'an, God instructed Muhammed (peace be upon him) to listen intently to each revelation as it emerged; he must be careful not to impose a meaning on a verse prematurely, before its full significance had

become entirely clear "(۱)

''قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا کہ وحی کو بغور سماعت کریں اور آیت کی تکمیل سے پہلے اپنی جانب سے کوئی مفہوم تھوپنے سے احتیاط کریں جب تک کہ اس کا مکمل مقصد اچھی طرح آشکار نہ ہو جائے۔''

مصنف نے اپنی اس گفتگو کی بنیاد جن آیات کریمہ پر رکھی ہے وہ یہ ہیں:

''وَ لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُهٗ'' (۲)

''اور قرآن میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تمہیں پوری نہ ہولے۔''

''لَا تُحَرِّکۡ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَ قُرۡاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ'' (۳)

''تم یاد کرنے کی جلدی میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ بے شک اس کا محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ تو جب ہم اسے پڑھ چکیں اس وقت اس پڑھے ہوئے کی اطاعت کرو۔''

مندرجہ بالا آیات کے واقعی مفاہیم کی تعیین کے لیے آیئے ہم سب سے پہلے شان نزول پر غور کرتے ہیں!

صدر الافاضل علامہ نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ مفہوم کی بہتر وضاحت کے پیش نظر مندرجہ بالا دونوں آیات کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ سرکار

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۵۷

۲- القرآن الکریم، سورۃ: ۲۰، آیت: ۱۱۴

۳- القرآن الکریم، سورۃ: ۷۵، آیت: ۱۸_۱۶

دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی، تو آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے اور جلدی جلدی دہراتے تاکہ خوب اچھی طرح یاد ہو جائے۔ اللہ رب العزت کو اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح مشقت میں پڑنا گوارا نہ ہوا۔ لہٰذا سورہ طٰہٰ میں اعلان کر دیا گیا کہ اے محبوب آپ مشقت میں نہ پڑیں اور سورہ قیامہ میں مزید وضاحت کے ساتھ مژدہ جاں فزا سنا دیا گیا کہ سینہ اقدس میں محفوظ کرنا بھی ہمارے ذمہ کرم پر ہے اور اسے زبان پر جاری کرنا بھی۔ (۱)

از راہ کرم مندرجہ بالا آیات کے نزول کا پس منظر ملاحظہ فرمایئے اور پھر مصنفہ کے قلم سے نکلے ہوئے دل خراش جملے پر نگاہ ڈالیے۔ کس قدر جارحانہ انداز بیان میں مصنفہ نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ جس کا آیات قرآنیہ کے مفاہیم سے دور دور تک کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر اپنی جانب سے آیات کریمہ کا ''خود ساختہ مفہوم دھوپنے'' کی ناپاک حرکت کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ یہ ہماری مذہبی عقیدت کیشی پر کاری ضرب کے مترادف ہے۔ اس طرح کی عبارتوں سے مقصود یہ ہے کہ خوش عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں مصطفےٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جو عقیدت و محبت اور عظمت و قدوسیت کے جذبات موجزن ہیں، انہیں کسی حد تک ٹھنڈا کر دیا جائے تاکہ مسلمان ان پر ایمان رکھنے کے باوجود انہیں اپنے سے برتر نہیں، بلکہ اپنے ہی جیسا ایک عام انسان سمجھنے لگیں، جو اختتام کلام سے پہلے ہی اپنی مرضی سے مدعائے سخن متعین کرنے کے لیے بے قرار دکھائی دیتا ہے۔

زیر بحث گفتگو کو ہر زاویے سے مکمل کرنے کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ مندرجہ بالا آیات کی وضاحت کے حوالے سے دوسری آراء کا بھی تذکرہ کر دیا جائے تاکہ حق و صداقت آفتاب نیم روز کی طرح عیاں ہو سکے۔

۱- دیکھیے، خزائن العرفان، ص: ۴۶۴، ۸۴۱

امام رازی نے اپنی کتاب میں متذکرہ بالا پہلی آیت کے حوالے سے چار اقوال لکھے ہیں۔ اختصار کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں!

پہلی رائے: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی سنتے ہوئے اسے جلدی جلدی دہراتے جاتے تھے تاکہ کوئی حصہ ذہن سے نکل نہ جائے۔ یہ رائے شیخ مقاتل، شیخ سدی اور شیخ ابن عباس رضی اللہ عنہم کی ہے۔

دوسری رائے: اس کا مطلب یہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مفہوم آیت کے حوالے سے نزول وحی سے قبل اپنے اصحاب پر اسے نہ پڑھیں۔ یہ رائے شیخ مجاہد اور شیخ قتادہ رضی اللہ عنہما کی ہے۔

تیسری رائے: شیخ ضحاک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مکہ، اسقف اور نجران کے لوگ بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں فلاں فلاں مسئلے کے بارے میں بتائیں۔ جاتے جاتے وہ یہ بھی کہہ گئے کہ اس سوال کے جواب کے لیے ہم نے تین دنوں کی مہلت طے کر رکھی ہے۔ پھر جب وحی میں تاخیر ہوئی یہ خبر اُڑا دی گئی کہ معاذ اللہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہود غالب آگئے ہیں۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نزول قرآن کے حوالے سے عجلت نہ کریں قبل اس کے کہ وہ لوح محفوظ سے حضرت اسرافیل تک اور وہاں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہوتا ہوا آپ تک نہ پہنچ جائے۔

چوتھی رائے: شیخ حسن رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئیں اور اپنے شوہر کے ذریعہ مکا مارے جانے کا شکوہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان قصاص کا حکم دے دیا کہ اتنے میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی تو آپ نے اپنے فیصلے پر عمل درآمد سے توقف فرمایا۔ پھر آپ پر ''اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ'' نازل ہوئی۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے آخری رائے لکھنے کے بعد کہا ہے کہ یہ حق سے بہت بعید

محسوس ہوتی ہے، جب کہ ان تمام آرا میں پہلی رائے کو قرین حق وصداقت قرار دیا ہے۔(۱)

متذکرہ بالا دوسری آیت کی تفسیر میں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ترمذی اور مسلم شریف کی صحیح حدیث نقل کی ہے۔ وہ یہ ہے۔(۲)

''عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللّٰہ عنہما: کَانَ رَسُولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا اُنْزِلَ الْقُرْاٰنَ یُحَرِّکُ بِہٖ لِسَانَہٗ یُرِیْدُ اَنْ یَّحْفَظَہٗ، فَاَنْزَلَ اللّٰہُ..... ''(۳)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہوتا تو آپ اپنی زبان سے اسے دہراتے تا کہ اچھی طرح یاد ہو جائے۔ تب اللہ رب العزت نے نازل فرمایا کہ........''

ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم دوران وحی خاموش رہتے اور حضرت جبریئل علیہ السلام کے رخصت ہو جانے کے بعد قرآن پڑھتے۔

ملاحظہ فرمایئے! کیرن آرمسٹرانگ نے جن دو آیات قرآنیہ کی بنیاد پر اپنی خود ساختہ فکر کی پرورش کی تھی، وہ اپنے اصل مفاہیم کے ساتھ آپ کے سامنے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مصنفہ کی رائے اور متذکرہ بالا دونوں آیات کے واقعی مفاہیم میں کس قدر بعد ہے؟ اب یقین آ ہی گیا ہوگا کہ مستشرقین عام طور پر قارئین کے دلوں میں علمی رعب و دبدبہ بٹھانے کے لیے اپنے افکار کو کثرت حوالہ جات سے

۱۔ دیکھیے، تفسیر کبیر، ج:۲۲، آیت:۱۰۵

۲۔ تفسیر قرطبی، ج:۱۹، ص:۱۰۵

۳۔ صحیح مسلم، ج:۳، آیت:۱۳۸

مزین کرتے ہیں، جب کہ گہرائی میں اتر کر حقیقت کا سراغ لگائیں، تو بسا اوقات
دونوں میں دور دور تک کوئی ارتباط نظر نہیں آتا۔

×××

سر چشمۂ علم و حکمت

آگے چل کر مصنفہ نے اعلان نبوت سے قبل سرکار دو عالم ﷺ کے مرتبہ علمی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"In common with the majority of Arabs at this time, Muhammad could neither read nor write."(1)

''اس دور میں عرب کی اکثریت عام طور پر بہ شمول محمد نہ پڑھ سکتی تھی اور نہ ہی لکھ سکتی تھی۔''

یہ کہنے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کی شخصیت کے حوالے سے اس طرح کے غیر مہذب جملے گو کہ ایک غیر مسلمہ کے قلم سے نکل رہے ہیں، لیکن اس قلم کی روشنائی ہمارے نام نہاد مسلم محققین ہی کی فراہم کردہ ہے۔ یقین نہیں آتا تو تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھ لیں، آپ کو ایک نہیں کئی ایک ایسے اسکالرس مل جائیں گے، جنھوں نے بہ نام تحقیق و جستجو نبی اکرم ﷺ کو معاذ اللہ ان پڑھ ثابت کرنے کی ناپاک کوششیں کی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ایک خوش عقیدہ مسلمان کے لیے اپنے مرکز عقیدت ﷺ کے حوالے سے دل خراش جملے سننا بہت دشوار ہے، لیکن کیا کریں کہ ہماری صفوں میں چھپے ہوئے نام نہاد محققین کی شناخت کے لیے لکھے بغیر چارہ بھی نہیں۔

۱۔ زیر بحث کتاب، ص: ۵۸

ذوقِ لطیف سے معذرت کے ساتھ ذرا مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے بہکے ہوئے قلم کا تیور ملاحظہ کیجیے، وہ کہتے ہیں کہ

ان لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالاں کہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضور کے ناخواندہ ہونے کو آپ کی نبوت کے حق میں ایک طاقت ور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے، جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور لکھے پڑھے تھے یا بعد میں آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا، وہ اول تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیوں کہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی، پھر وہ بجائے خود بھی اتنی کم زور ہیں کہ ان پر کسی استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔.........'' (۱)

آگے چل کر کبار محققین کے دلائل و براہین کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہاتھوں سے لفظ ''رسول اللہ'' مٹا کر اس کی جگہ ''محمد بن عبد اللہ'' لکھ لینا، ان کے پڑھے لکھے ہونے کی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ یہ ممکن ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا کر ''محمد بن عبد اللہ'' لکھنے سے انکار کر دیا، تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھ کر یہ الفاظ مٹا دیے ہوں اور پھر کسی دوسرے سے ''محمد بن عبد اللہ'' لکھوا دیے ہوں۔ تاہم اگر واقعہ یہی ہو کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے ہی ہاتھوں سے لکھا ہو، تو ایسی مثالیں کثرت سے مل جاتی ہیں کہ ان پڑھ لوگ بھی اپنے نام لکھنے پر تو قادر ہی ہوتے ہیں۔ (۲)

ٹھیک ہے جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی ابھرتا ہے، لیکن یہ بھی کیا کہ

۱- دیکھیے، تفہیم القرآن، ج:۳، ص:۷۱۳، مطبوعہ ترجمان القرآن، لاہور

۲- دیکھیے، تفہیم القرآن، ج:۳، ص:۷۱۳، مطبوعہ ترجمان القرآن، لاہور

شعور و آگہی کے بڑھتے ہوئے حاصلات پر ہی روک لگا دی جائے؟ کاش اسے اپنے حال پر بھی چھوڑ دیتے تو اس خطرناک نتیجے تک شاید نہ پہنچ پاتا۔ موصوف نے اِستدلالات کی روشنی میں اپنی فکر کی بنیاد نہیں رکھی ہے، بلکہ اپنے مزعومہ افکار و خیالات کی بنیاد پر دلائل و براہین کے تانے بانے جمانا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ کوشش صرف اس قدر ہے کہ اپنی فکر کو کسی بھی طرح دلائل سے ثابت کر دیا جائے، نہ یہ کہ دلائل کی روشنی میں اپنی فکر کی تہذیب و اصلاح کی جائے۔ اسی لیے تو جناب ابوالاعلیٰ مودودی نے استدلال کرتے ہوئے بخاری شریف کے صریح کلمات سے مترشح ہونے والے مفہوم کی بے جا توجیہ کرتے ہوئے کہہ پڑے کہ "آپ نے حضرت علی سے پوچھ کر قلم زد کیا ہو اور دوسرے نے لکھا ہو۔" اسے کہتے ہیں مفاہیم و مدلولات کی تعیین کے لیے الفاظ و بیان سے بے نیاز ہو کر محض اپنے طے کردہ خیالات کی اطاعت کرنا۔

مسئلے کی وضاحت کے لیے بخاری شریف کے الفاظ پر غور کیجیے!

"فاخذ رسول اللّٰہ الکتاب فکتب: ھذا ما قاضی علیہ محمد بن عبد اللّٰہ ...." (۱)

"جب حضرت علی رضی اللہ عنہ 'رسول اللہ' کے الفاظ مٹانے کی ہمت نہ جٹا پائے، تو صلح نامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لیا، پھر لکھا کہ یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی ہے کہ کوئی شخص مکہ میں ہتھیار لے کر داخل نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ تلوار نیام میں رہے.........."

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ مذکورہ بالا عبارت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہ ذاتِ خود لکھنے کی کس قدر صراحت موجود ہے؟ خدارا اپنے ضمیر کی آواز پر فیصلہ کیجیے کہ

۲- بخاری، کتاب الصلح، ج:۲، ص:۹۶۰

اسے خودساختہ معنی پہنادینا کتنی بڑی زیادتی ہے؟ اچھا پھر گفتگو کرتے ہوئے بہکتے قلم کالب ولہجہ دیکھیں کہ ”اپنا نام تو ان پڑھ بھی لکھ لیتے ہیں......“، یعنی طے کرلیا ہے کہ کلمات وبیانات اور مفاہیم ومدلولات کے سینے پر پوری طاقت کے ساتھ پے در پے وار کرتے رہو تاکہ وہ کھڑے ہو کر اپنے واقعی مفہوم کی ادائیگی کے قابل نہ رہیں!

یہاں تک تو ہم نے اس بنیاد کی حقیقت بے نقاب کی ہے، جس کے سہارے مفروضہ فکر کا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ اب آیئے ذرا تصویر کے دوسرے رخ پر نگاہ ڈالتے ہیں اور دلائل وبراہین کے ساتھ خوش عقیدہ مسلمانوں کی مستحکم بنیادوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم علمائے محققین اور معتمد اسلاف کرام کی تشریح وتوضیح بیان کریں، یہ وضاحت کردینا چاہتے ہیں کہ اس کتاب کی تنگ دامانی ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ اسے بہت زیادہ تفصیلات کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اس لیے جو کچھ بھی پیش کیا جائے گا، وہ اختصار کے احاطے ہی میں رہے گا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے اور پڑھنے پر دلائل:

پہلے ہم قرآن مقدس سے دلائل ذکر کریں گے، پھر علماء ومحدثین اور فقہائے کرام کی عبارتیں نقل کریں گے:

۱- قرآن مقدس میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم کے حوالے سے ارشاد فرماتا ہے:

”وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ“(۱)

”اے محبوب محترم! آپ نزول قرآن سے پہلے نہ ہی کوئی کتاب پڑھتے

۱- القرآن الکریم، سورت: العنکبوت، آیت: ۴۸

تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، کہ ایسی حالت میں حق ناشناس لوگ قرآن مقدس کی حقانیت کے حوالے سے ضرور کچھ شبہ نکالتے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلان نبوت سے قبل اگر سرکار دو عالم ﷺ کے بارے میں لکھنے پڑھنے پر قدرت ثابت ہو جاتی تو دشمنوں کو قرآن مقدس کی حقانیت پر زبان طعن دراز کرنے کا موقع مل جاتا، لیکن اعلان نبوت کے بعد یہ خدشہ جاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ متذکرہ بالا آیت قرآنیہ سے زمانہ ماضی میں سرکار دو عالم ﷺ کے لکھنے پڑھنے پر عدم قدرت کا اشارہ مل رہا ہے، آئندہ کے لیے نہیں۔ شیخ آلوسی نے روح المعانی میں بڑی دل لگتی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کے لکھنے پڑھنے پر عدم قدرت کو کفار و مشرکین کی طعنہ زنی کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اعلان نبوت کے بعد لکھنے پڑھنے پر قادر تھے، ورنہ تو یہ مشروط عبارت بے فائدہ ہو جائے گی۔ (۱)

۲۔ صلح حدیبیہ کے ضمن میں رسول اکرم ﷺ کے لکھنے کے حوالے سے تذکرہ گزر چکا ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حضرت برا ابن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کردہ اسی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ

"فَاَخَذَ رَسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الکِتَابَ۔ وَ لَیسَ یُحْسِنُ یَکْتُبُ۔ فَکَتَبَ........"(۲)

یعنی تو رسول اکرم ﷺ نے صلح نامہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور وہ بہت مہارت سے نہیں لکھتے تھے۔ پھر لکھا.....

حضرت برا ابن عازب رضی اللہ عنہ کا یہ اضافہ کہ آپ ﷺ بہت صاف نہیں لکھتے تھے،

۱۔ دیکھیے، روح المعانی، ج:۲۱، ص:۵، مطبوعہ بیروت

۲۔ بخاری، باب عمرۃ القضاء، ج:۳، ص:۱۵۵۱

وضاحت کے ساتھ اشارہ کر رہا ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے۔اور یہ بات کہنے کی نہیں کہ کسی سے اگر ایک بار بھی لکھنا ثابت ہو جائے تو ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے لکھنے پڑھنے پر قدرت نہیں ہے۔

۳- سنن بیہقی میں ہے کہ معلم کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو نجران بھیجتے ہوئے خوں بہا دینے کی تفصیلات لکھ کر دی تھیں۔روایت حدیث کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

”فَكَتَبَ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فيه: هٰذا بيان من الله عز و جل.......“(۱)

”معلم کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا کہ یہ احکامات اللہ عزوجل اور اس کے رسول کی طرف سے ہیں........“

۴- جنت خیبر کے موقع پر حضرت عبداللہ بن سہل قتل کر دیے گئے۔جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپ نے یہود کے لیے ایک فرمان جاری کیا۔جس کی روایت کرتے ہوئے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”فَكَتَبَ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اليهم فی ذلك..“(۲)

”رحمت دوعالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے لیے اس حوالے سے ایک فرمان لکھا۔“

اسی طرح حضرت عباس، حضرت عائشہ اور حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہم کی روایت کردہ احادیث سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھنے پر قدرت کا پتہ چلتا ہے۔تاہم اس امر سے انکار نہیں کہ علمائے کرام کے درمیان زیر بحث موضوع کے حوالے سے

۱- سنن بیہقی، ج:۱۲، ص:۱۲۷

۲- مسلم، باب القسامہ، ج:۱۱، ص:۱۲۶

مختلف آرا ہیں اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب دونوں طرح کی روایات میں تطبیق ممکن ہے، تو پھر علمائے محققین کے نزدیک تطبیق ہی سب سے بہتر ہے۔ تطبیق کی اس سے بہتر صورت اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ حکمت الٰہی کے پیش نظر اعلان نبوت سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دنیاوی درس گاہ میں زانوئے تلمذ تہ کرتے ہوئے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تاکہ حبیب مکرم سے کسی سے سیکھ کر قرآن پیش کرنے کے ممکنہ الزامات کی جڑیں کاٹ دی جائیں، لیکن اعلان نبوت کے بعد جب یہ خدشہ جاتا رہا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے خود ہی حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ سکھا دیا تاکہ دوسروں کو آپ پر نقص صلاحیت ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آسکے اور نہ ہی کسی انسان کو استاذی جتانے کا۔

×××

اعلائے کلمۃ الحق سے گریز نہیں

رسول اکرم ﷺ کی سیاسی بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کیرن آرمسٹرانگ تحریر کرتی ہیں:

"In his desire to avoid a serious dispute, Muhammad did not, at this stage, emphasize the monotheistic content of his message."(۱)

''حضرت محمد ﷺ نے سخت اختلافات سے بچنے کے پیش نظر ایسے وقت میں وحدانیت خدا کے تصور پر زیادہ زور نہیں دیا۔''

متذکرہ بالا عبارت میں موصوفہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے تحریک اسلام کے ابتدائی زمانے میں وحدانیت الٰہی کے بنیادی تصور کی نشرواشاعت پر زور نہیں دیا، تاکہ مکہ کے کفار ومشرکین کی طرف سے کسی بڑی مزاحمت سے بچا جا سکے۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان جملوں سے مصنفہ سرکار دوعالم ﷺ کی فراست ودانائی کی تحسین نہیں کر رہی ہیں، بلکہ ایک نہیں دو دو الزامات عائد کر رہی ہیں، ایک یہ کہ معاذ اللہ سرکار دوعالم ﷺ کسی ماہر سیاسی بازیگر کی طرح اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے کفروشرک کے خلاف آواز بلند کرنے سے بچتے رہے، اور دوسرا یہ کہ پیغام اسلام کے برحق ہونے کے باوجود اسے چھپاتے رہے۔

۱- زیر بحث کتاب، ص:۶۸

دیکھ رہے ہیں آپ یہ الزامات کس قدر سنگین ہیں؟ اسے تسلیم کر لینے کے بعد منصب رسالت کی ساری بزرگی و برتری خاک آلود ہونے لگتی ہے۔ وقتی مصلحت کی بنیاد پر کسی جزوی بہتری سے صرف نظر کرنا اور بات ہے، لیکن پیغام اسلام کے مرکزی عقیدے کو پس پشت ڈال دینا اور بات ہے۔ دونوں میں کسی طرح کی کوئی مماثلت نہیں۔ کیا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے کہ اسلامی عقائد کی سب سے بڑی بنیاد "وحدانیت الٰہی" ہے، جب اسے ہی چھپا لیا جائے، تو پھر مذہب اسلام کی مستحکم عمارت استوار کیوں کر ہو سکتی ہے کہ یہی عقیدہ سارے عقائد و اعمال اور معمولات و عبادات کا سر چشمہ ہے، اسے تسلیم کرنے کے بعد ہی رسالت، امارت، عبادت اور تصور آخرت سے شناسائی ممکن ہو سکی ہے۔

یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ کیرن آرمسٹرانگ اس نتیجے پر کیسے پہنچی ہیں؟ جب کہ دوسری جانب ہمیں تاریخ سیرت میں ایسے بہتیرے واقعات مل جاتے ہیں، جن سے آفتاب نیم روز کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ معلم کائنات رسول اکرم ﷺ نے پوری قوت، جرأت مندی اور بہادری کے ساتھ وحدانیت الٰہی کا اعلان کیا اور معبودان باطل کی تردید کی ہے۔

اس حوالے سے ایک دو شواہد آپ بھی ملاحظہ فرمالیں!

پہلی شہادت:

وحی الٰہی کی ابتدا کے چند دنوں بعد اللہ رب العزت نے اپنے حبیب سرکار دو عالم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" (۱)

"اے بالا پوش اوڑھے ہوئے محبوب محترم، اٹھیے اور لوگوں کو خبردار کیجیے!"

۱- القرآن الکریم، سورت: مدثر، آیات: ۱، ۲

دورِ جدید کے عظیم محقق حضرت پیر کرم شاہ الازہری متذکرہ بالا آیت کریمہ کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اپنے رب کریم کا یہ حکم ملتے ہی معلم کائنات سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کمر ہمت باندھ لی۔ حق کا علم بلند کرنے کے لیے، ظلمت کدہ عالم کو نور توحید سے منور کرنے کے لیے، باطل کو ہر میدان میں شکست فاش دینے کے لیے، یتیم مکہ نے عزم مصمم کرلیا۔ بادیہ ضلالت میں صدیوں سے بھٹکنے والے قافلہ انسانیت کو منزل مراد تک پہنچانے کے لیے جو قدم اٹھایا، وہ ہمیشہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ مخالفت کا کوئی طوفان اس کی برق رفتاری کو متاثر نہ کر سکا۔" (۱)

مَیں سمجھتا ہوں کہ شیخ پیر کرم شاہ ازہری صاحب کی روشن و تاب ناک تصریحات کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار سے حکم پاتے ہی پیغام حق کی تشہیر شروع کردی اور منصب رسالت کے تقاضوں سے ایک لمحے کے لیے بھی کبھی پیچھے نہ ہٹے۔

دوسری شہادت:

تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کثیر العیال تھے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح خوشحال نہ تھے۔ ایک بار جب مکہ میں شدید قحط پڑا اور مالی حالات بڑے سخت ہو گئے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوسرے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ایسے نازک حالات میں اپنے چچا ابو طالب کے بوجھ بانٹنے کی کوشش کرنی چاہیے، جس کے لیے کیا ہی بہتر ہوتا

۱۔ ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۲، ص:۲۱۷

کہ ہم دونوں ان کے ایک ایک بیٹے کو اپنی کفالت میں لے لیں۔ بلاشبہ یہ تجویز بڑی بھلی لگی اور دونوں ابوطالب کے پاس گئے اور اپنی تجویز سے انہیں باخبر کیا۔ ابوطالب نے کہا کہ میرے دو بیٹوں عقیل اور طالب کو میرے پاس رہنے دیں، اور دوسرے دو بیٹے علی اور جعفر کو آپ اپنی کفالت میں رکھ لیں۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت میں آگئے اور حضرت جعفر جناب عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شانہ نبوت میں پروان چڑھ رہے ہیں، تو ایک دن سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رہا نہ گیا اور انہوں نے پوچھ لیا کہ آپ دونوں ابھی کیا کر رہے تھے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن الفاظ میں جواب دیا وہ زیر بحث موضوع سے بڑی حد تک مطابقت رکھتے ہیں، ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''فقال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم: دین اللہ الذی اصطفاہ لنفسہ و بعث بہ رسولہ فادعوك الی اللہ وحدہ لا شریك لہ و الی عبادتہ والی الکفر باللات و العزی ''(۱)

''سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ کا دین ہے، جسے اس نے اپنے لیے پسند فرمایا ہے اور اس کی تشہیر کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں، لہٰذا میں تمہیں خدائے وحدہٗ لاشریک اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں، اور لات وعزیٰ کے انکار وتردید کی بھی۔''

اپنے ماتھے کی آنکھ سے دیکھ لیا ہوگا کہ کس وضاحت کے ساتھ نہ صرف سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحدانیت الٰہی کے تصور کو قبول کرنے کی دعوت دی ہے، بلکہ اہل مکہ کے نزدیک بڑے ہی محترم و معظم سمجھے جانے والے معبودان باطل کی تردید بھی کی ہے۔

۱- سیرت حلبیہ، ج:۱، ص:۴۳۱

بہت ممکن ہے کہ کوئی یہ کہہ دے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو آپ کے پروردہ تھے، اس لیے ان سے رازداری میں یہ بات کہہ دی ہے۔ اس خدشے کو دور کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بعد کا وہ واقعہ پڑھیے، جب وہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکے کی وادی میں نماز ادا فرما رہے تھے کہ اتنے میں ابوطالب ادھر آ نکلے اور دونوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ نماز پڑھنے کی دل موہ لینے والی ادائیں ان کے لیے بالکل نئی تھیں، اس لیے پوچھ بیٹھے۔ خصوصیت کے ساتھ ان کے استفسار کے الفاظ پر غور کریں تو میرا مدعا آفتاب نیم روز کی طرح عیاں ہو جائے گا۔ ابوطالب کہتے ہیں:

"یا ابن اخی! ماهذا الدین الذی اراك تدین به......"(۱)

"اے میرے بھتیجے! یہ کس دین پر ایمان رکھتے ہوئے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

ابوطالب نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں، بلکہ پوچھ رہے ہیں کہ آپ نے کس دین کو اختیار کر رکھا ہے؟ یہ انداز استفسار مترشح کر رہا ہے کہ پہلے سے ابوطالب کے کانوں تک یہ خبر کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچ چکی تھی کہ ان کے بھتیجے نے اہل مکہ کے آبائی مذہب کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کو اختیار کر رکھا ہے۔ چلیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے تھے، اس لیے انہیں گھر میں ہونے والے مظاہر عبادت سے دین اسلام کی خوش بو پہنچ گئی، لیکن ابوطالب تو باہر کے تھے، انہیں کیوں کر پیغام اسلام کی خبر ہو گئی؟ لہٰذا یہ ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کے بنیادی عقائد کو چھپانے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی، بلکہ جب بھی موقع میسر آیا، اس کی حقانیت کے اظہار سے پیچھے نہ ہٹے۔ اور یہ امر بالکل درست ہے کہ جب انسان دن کا اثبات کر دے، تو ان لوگوں کی تردید خود بہ خود ہو جاتی ہے، جو اسے رات کہہ

۱- سیرت ابن ہشام، ج:۱، ص:۲۴۷

رہے ہیں، بعینہ اسی طرح جب خدائے واحد و یکتا کے وجود کا اعلان ہو گیا، تو ان لوگوں کے عقائد کی تردید خود بہ خود ہو گئی جو اس کے ساتھ شرکاء گھڑتے رہے تھے۔

تیسری شہادت:

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی عفت و عصمت، شرافت و پاک دامنی اور اخلاق و اطوار کی وجہ سے مکے میں عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا، تو بلا تامل آپ ایمان لے آئے اور اسی کے ساتھ اپنے حلقہ احباب میں پیغام حق کی تبلیغ بھی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی لوگ دامن اسلام سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں حضرت عثمان غنی، حضرت زبیر بن العوام، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی، تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم شریف کے احاطے میں دعوت اسلام کے اعلان کی اجازت دے دی۔ سارے مسلمان حرم شریف کے صحن میں پہنچے اور اپنے اپنے قبائل کے درمیان بیٹھ گئے۔ اسی دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے۔ اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور پیغام حق کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ یہ سنتے ہی کفار آگ بگولہ ہو گئے اور مشتعل ہو کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ نشانے پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ کفار نے انہیں زد و کوب کیا، دھکے دے کر گرا دیا اور سینے پر چڑھ کر اذیت دیتے رہے۔ اسی دوران عتبہ بن ربیعہ ادھر آ نکلا اور اس نے اپنے جوتے اتارے اور آپ کے چہرے اطہر پر پے در پے ضرب لگائی۔ کچھ دیر بعد جب یہ افسوس ناک خبر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قبیلہ تک پہنچی، تو وہ بھاگتے ہوئے آئے

اور مشرکین کے چنگل سے انہیں چھڑا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ تاریخ کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ شدت ضرب سے بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آتے، تو بس یہی پوچھتے کہ میرے محبوب مکرم کیسے ہیں؟(۱)

مندرجہ بالا تاریخی واقعہ سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کفار و مشرکین کے معبودان باطلہ کی تردید سے گریز کرتے رہے، تو پھر دشمنان اسلام کی جانب سے یہ غیض و غضب کیوں کر ہے؟ کیا یہ تصور کسی بھی طرح ممکن ہے کہ ان کے خداؤں پر تنقید سے گریز کرنے کے باوجود وہ اس قدر مشتعل ہو گئے تھے؟ عقل اسے کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ ویسے اسی واقعے میں حضرت ابو بکر صدیق صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اعلان حق کا ذکر جمیل بھی تو ہے، جو اہل انصاف کو چیخ چیخ کر بتا رہا ہے کہ مرکز عقیدت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پیغام اسلام کی اشاعت کرتے ہوئے معبودانِ باطلہ پر کھل کر تنقیدیں کرتے رہے ہیں۔

×××

۱- دیکھیے، سیرہ نبویہ: ابن کثیر، ج:۱، ص:۴۳۹-۴۴۱

واقعہ غرانیق کی حقیقت

مصنفہ نے واقعہ غرانیق کو جس انداز سے عین حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اسے بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے پس منظر کے بارے میں قدرے اختصار کے ساتھ گفتگو کر لی جائے، تاکہ تاریخی دستاویز کی وہ بنیادیں بھی قارئین کی نگاہوں کے سامنے رہیں، جن کے سہارے موصوفہ نے توہمات کی عمارت کھڑی کی ہے۔

اس واقعہ کے حوالے سے شیخ ابن جریر طبری نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی قوم کو پیغام حق سے روگردانی کرتے ہوئے دیکھا، تو یہ خواہش جاگ اٹھی کہ کاش اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی بات آجاتی جو مجھے میری قوم سے قریب کر دیتی۔ اسی درمیان اللہ تعالیٰ نے سورہ نجم نازل فرمائی۔

جس کی آیت "اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰی وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی" پر پہنچے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کیا آپ نے لات، عزّیٰ اور تیسری مناۃ کو دیکھا، اتنے میں شیطان نے اپنی طرف سے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیے کہ "تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْاُوْلٰی وَ اِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ تُرْتَجٰی" یعنی یہ مرغان بلند بانگ ہیں اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ سورت کے اختتام پر نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے سارے مسلمان سجدے میں گر پڑے اور ساتھ ہی مشرکین بھی اپنے معبودوں کی

توصیف سن کر سجدہ ریز ہو گئے۔ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام حاضر بارگاہ رسالت ہوئے اور کہا کہ آپ نے ایک ایسی آیت کی تلاوت کی ہے، جسے میں نے اللہ کی طرف سے آپ پر نہیں اتارا ہے۔ یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت ہی رنجیدہ اور خوفزدہ ہو گئے، تو اللہ رب العزت نے تسلی دیتے ہوئے سورہ حج کی آیت نازل فرمائی۔(۱)

سورہ حج کی وہ آیت کریمہ یہ ہے:

”وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ، فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ، وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ“ (۲)

”ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول یا نبی بھیجے سب کے ساتھ کبھی نہ کبھی یہ واقعہ ضرور گزرا ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم کی اصلاح و ہدایت کی آرزو کی تو شیطان نے لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈال کر ایفائے آرزو میں رخنہ ڈال دیا، یاد رہے کہ اللہ شیطانی شبہات کے اثر کو مٹا دیتا ہے اور اپنی نشانیوں کو پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیتا ہے، اللہ سب کچھ جاننے والا بھی ہے اور سرچشمہ حکمت و دانائی بھی۔ (فیضان القرآن)

آپ نے واقعہ غرانیق کے پس منظر کی ایک جھلک دیکھ لی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم امام جریر طبری کے بیان کردہ کلمات پر بحث کریں، مصنفہ کے قلم سے نکلے ہوئے تیر و نشتر بھرے چند جملے سنتے چلتے ہیں، تاکہ ایک طرف پچھلی روایت کی صداقت طشت از بام ہو جائے گی اور دوسری طرف مصنفہ کے افکار و خیالات کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔

۱- دیکھیے، تفسیر طبری، ج:۱۷، ص:۱۳۱

۲- القرآن الکریم، سورت:۲۲، آیت:۵۲

اس واقعہ کے نقل کرنے سے پہلے مصنفہ تمہید باندھتی ہوئی رقم طراز ہیں؛

"Muhammad (Peace be upon him) had been longing for peace with the Quraysh; he knew how devoted they were to the goddesses and may have thought that if he could find a way of incorporating the gharaniq into his religion, they might look more kindly on his message."(۱)

''محمد (ﷺ) پہلے سے خواہش رکھتے تھے کہ قریش کے ساتھ امن قائم ہو جائے، وہ جانتے تھے کہ اہل مکہ کس قدر دیویوں سے قربت رکھتے ہیں، یا انہوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ اگر وہ کسی طرح غرانیق کو اپنے مذہب میں شامل کر لیں، تو بہت ممکن ہے کہ وہ لوگ ان کے لائے ہوئے پیغام حق کے حوالے سے نرم پڑ جائیں۔''

ہو سکے تو ذرا امام طبری کے ذریعہ نقل کیے ہوئے واقعہ پر ایک بار پھر نظر ڈالیے اور متذکرہ بالا وہم وخیال کو اس پر بٹھانے کی کوشش کیجیے، پھر تماشہ دیکھیے کہ دونوں کے درمیان کس قدر بعد وتناقض ہے؟ کہاں رسول اکرم ﷺ کا اپنی قوم کی اصلاح کے حوالے سے متفکر رہنا اور کہاں ان کے معبودان باطلہ کے ساتھ مصالحت کی خواہش؟ دیکھ رہے ہیں دونوں خواہشات کے درمیان فرق وانتشار! سوچتا ہوں تو سر پھٹنے لگتا ہے کہ غیر جانب دارانہ بحث وتحقیق کی اوٹ میں افکار وخیالات کی کیسی کیسی غلاظتیں پنہاں ہیں؟ ایک خلاف واقعہ امر کو حقیقت کے روپ میں ڈھالنے کے لیے

۱۔ زیر بحث کتاب، ص: ۷۰

مصنفہ نے اپنی مرضی سے ایک ایسا الزام نبی اکرم ﷺ کے سر تھوپ دیا ہے، کہ جس کے ہوتے ہوئے وحدانیت الٰہی کے تصور کی مستحکم و مضبوط عمارت متزلزل ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معلم کائنات رسول اکرم ﷺ اپنی قوم کے شرک و کفر کے حوالے سے نہایت ہی فکر مند رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہو کر عذاب الٰہی سے بچ جائیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان کے معبودان باطلہ کو بھی تسلیم کر لینے کے لیے تیار تھے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

اس موہومہ واقعہ کے بعد حالات وواقعات کی سرگذشت مصنفہ اس طرح سے بیان کرتی ہیں کہ جیسے وہ اپنے ماتھے کی آنکھ سے دیکھ رہی ہوں۔ ذرا آپ بھی سنیئے!

"While everybody else was clebrating, Muhammad (Peace be upon him) went home, shut himself away, and meditated. That night Gabriel, the sprit of revelation, came to him "What have you done, Muhammad?" he asked................He was immediately contrite, but God consoled him with a new relelation. All the previous prophets had made similar "Satanic" mistakes."(۱)

"اس واقعے کے بعد جب سارے لوگ اظہار مسرت کر رہے تھے، محمد (ﷺ) اپنے گھر پہنچے اور سب سے دور تنہائی میں مراقب ہو گئے۔ اسی

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۷۲

رات وحی لانے والے جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آپ نے کیا کیا؟......انہیں فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، لیکن اللہ نے دلاسہ دیتے ہوئے ایک نئی وحی نازل فرمائی کہ سارے سابقہ پیغمبروں نے بھی اسی طرح کی شیطانی غلطی کی ہے۔"

معاذ اللہ من ذالک، مجھے احساس ہے کہ خوش عقیدہ مسلمانوں کے لیے متذکرہ بالا عبارت کا پڑھنا نہایت ہی تکلیف دہ ہے، لیکن کیا کروں کہ علاج مرض کے لیے مرض کی تفصیلات سے آگاہی بھی ضروری ہے۔

یہاں موصوفہ کی دو باتیں قابل توجہ ہیں، ایک یہ کہ اللہ نے دلاسہ دیتے ہوئے وحی نازل فرمائی کہ اسی طرح سابقہ انبیائے کرام سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں اور دوسری بات یہ کہ واقعہ غرانیق کی آنے والی رات میں یہ وحی نازل ہوئی۔ یعنی ایک ہی جھٹکے میں سارے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیائے کرام کے لیے صدور گناہ بھی ثابت کر دیا اور اس فیصلے کی نسبت کسی دوسرے کی طرف نہیں، بلکہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف ثابت کر دی۔ آنے والے صفحات میں، ہم ان میں سے ہر ایک مسئلے پر گفتگو کریں گے۔

اب آیئے میں امام طبری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کردہ عبارت کو دلائل و براہین اور تاریخی حقائق و معلومات کی روشنی میں دیکھتے ہیں، تاکہ مصنفہ کے توہمات کا پردہ بھی فاش ہو جائے اور واقعہ غرانیق کی واقعی حیثیت بھی دنیا کے سامنے آجائے۔ اس مسئلہ پر ہم تین زاویوں سے روشنی ڈالیں گے، پہلے قرآن کریم سے، پھر احادیث نبویہ اور پھر عقلیات کے سہارے موضوع بحث کو پرکھنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن کریم سے:

اس امر سے کسے اختلاف ہو سکتا ہے کہ واقعہ غرانیق کی حقیقت کشائی کے لیے آیات قرآنیہ بہترین پیمانہ ہیں، کہ ان کے سہارے حق و باطل، صدق و کذب اور نور و ظلمت کے درمیان آسانی کے ساتھ حد فاصل کھینچا جا سکتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ جب ہم اس پس منظر میں متذکرہ واقعہ کو دیکھتے ہیں، تو حق و صداقت اور عدل و انصاف کی صدائیں صاف آواز دے رہی ہوتی ہیں کہ واقعہ غرانیق جس پیغام پر مبنی ہے، اس کی تصدیق کسی طور نہیں کی جا سکتی۔ وہ کلمات جو شیطانی القاء سے منسوب کیے گئے ہیں، اجمالی طور پر یہی تو ہیں کہ "لات، عزّیٰ اور تیسری منات نامی بتوں کی شفاعت بارگاہ الٰہی میں مقبول ہے۔" کیا یہ بھی کہنے کی بات ہے کہ یہ تصور ہی سرے سے باطل ہے اور واقعی ہے، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شیطان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اس طرح کے باطل تصورات کی آمیزش "آیات قرآنیہ" میں کر دے؟

جواب کے لیے مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ پر توجہ فرمائیں۔

پہلی آیت: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

"وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ، لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ، ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ" (۱)

"بالفرض اگر وہ کوئی ایک بات بھی گھڑ کر میری طرف منسوب کرتے، تو ہم بڑی سختی کے ساتھ ان سے نپٹتے، پھر ان کی رگ جاں کاٹ دیتے۔"

(فیضان القرآن)

امام ابن کثیر متذکرہ بالا آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کفار و مشرکین کے گمان کے مطابق اگر معلم کائنات سرکار دو عالم ﷺ اپنی طرف سے کچھ کہہ کر ہماری طرف

۱- قرآن کریم، سورت: ۶۹، آیات: ۴۴، ۴۵، ۴۶

منسوب کر دیتے تو ہم انتقام لینے میں دیر نہ کرتے، بلکہ انہیں گرفت کر لیتے اور رگ جاں کاٹ ڈالتے۔(۱)

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ تاریخی اعتبار سے واقعہ غرانیق کو ہجرت سے پہلے کا بتایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر ذرہ بھر اس میں صداقت ہوتی، تو وعید الٰہی کا ظہور ہوتو ہجرت سے پہلے ہی ہو چکا ہوتا اور جب یہ نہیں ہوا تو، یہ امر دوپہر کی دھوپ کی طرح عیاں ہو گیا کہ واقعہ غرانیق میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

دوسری آیت: اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے کہ

''قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَائِ نَفْسِيْ، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ''(۲)

''آپ کہیے کہ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس میں اپنی طرف سے میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی کر دوں، میں تو بس اسی کے تابع ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''

اس آیت کریمہ میں بھی صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اللہ رب العزت کے علاوہ کسی کی مجال نہیں کہ وہ آیات قرآنیہ میں اپنی جانب سے کسی قسم کی کوئی آمیزش کر سکے۔

تیسری آیت: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى''(۳)

''ان کی گفتگو تو وہی ہوتی ہے، جس کی انہیں وحی کی جاتی ہے۔''

۱- دیکھیے، تفسیر ابن کثیر، ج:۸، ص:۲۳۳

۲- قرآن کریم، سورت:۱۰، آیات:۱۵

۳- قرآن کریم، سورت:۵۳، آیت:۴

یہاں بھی بہت وضاحت کے ساتھ پروردگار کائنات اپنے محبوب سرکار دو عالم ﷺ کی زبان سے کہلوا رہا ہے کہ ان کی بات سرتا سر وحی الٰہی پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کا امکان ہی نہیں کہ آپ کسی دوسرے کی مرضی سے کچھ کہیں، وہ جب بھی کہتے ہیں اپنے پروردگار کی ہدایت کے مطابق ہی کہتے ہیں۔ کہنے دیجیے کہ اس آیت کریمہ نے قرآن کریم میں خارجی آمیزش کے سارے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے ہیں۔ لہٰذا اگر واقعہ غرانیق کو تسلیم کر لیا جائے، تو قرآن کریم کی صداقت ہی مشکوک ہو جائے گی اور یہ بلاشبہ باطل ہے، مردود ہے۔

چوتھی آیت: اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے کہ

"اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ"(۱)

"اے شیطان! بے شک جو میرے سچے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔" (فیضان القرآن)

علامہ نسفی زیر بحث واقعہ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اگر نبی اکرم ﷺ نے جان بوجھ کر یہ کلمات شامل کر لیے، تو یہ باطل ہے کیوں کہ یہ کفر ہے اور کفر کا صدور انبیائے کرام سے ممکن نہیں، اور اگر شیطان نے بہ زور آپ کی زبان سے یہ کلمات کہلوا دیے تو بھی یہ باطل ہے، کیوں کہ مندرجہ بالا آیت کریمہ کی روشنی میں جب ایک خاص بندے پر شیطان کا زور نہیں چل سکتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اخص الخاص بندے پر اس کا زور چل جائے۔ پھر اگر یہ کلمات آپ کی زبان پر سہواً جاری ہو گئے، جب بھی یہ باطل ہے، کیوں کہ اس طرح کی غفلت آپ کے حوالے سے جائز نہیں۔ (۲)

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

۱- قرآن کریم، سورت: ۱۷، آیت: ۶۵

۲- دیکھیے، تفسیر نسفی، ج: ۳، ص: ۱۶۰۔

"لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ" (۱)

"جس کے سامنے پیچھے کسی بھی جہت سے کوئی باطل در انداز نہیں ہو سکتا۔"

احادیثِ کریمہ سے:

یہاں ہم زیر بحث واقعہ کے حوالے سے روایت کردہ حدیث پر فنی اعتبار سے گفتگو کریں گے، تاکہ قارئین کے سامنے اس روایت کی واقعی حیثیت اچھی طرح قارئین پر بے نقاب ہو جائے۔

پہلی دلیل: امام بخاری نے سورہ نجم کے اخیر میں سجدہ کرنے والی روایت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں سجدے کیے اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا، لیکن امام بخاری واقعہ غرانیق کے حوالے سے کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ (۲)

امام بخاری رحمہ اللہ کی ذات سے یہ توقع بہت بعید ہے کہ وہ واقعہ کی صداقت کے باوجود اسے نظر انداز کر دیں۔ اس لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ قصہ غرانیق کا پہلا حصہ غیر یقینی ہے، جب کہ دوسرا حصہ جس کا تعلق مسلمان اور کافروں کے سجدہ کرنے سے ہے، وہ برحق ہے۔ کہیں یہ سوال تشنہ وضاحت نہ رہ جائے کہ مسلمانوں کے سجدے کرنے کی بات تو قابل فہم و ادراک ہے، لیکن مشرکوں نے آخر کس جذبے میں سجدے کیے؟ اس حوالے سے عرض یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنے معبودانِ باطلہ کے نام وحی الٰہی کے ضمن میں سنے تو بے ساختہ سجدے میں گر پڑے۔ اور اس توجیہ میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۱- قرآن کریم، سورت: ۴۱، آیت: ۴۲

۲- دیکھیے، بخاری، رقم حدیث: ۱۰۷۱

دوسری دلیل: واقعہ غرانیق کی روایت صحاح ستہ میں سے کسی بھی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔اصحاب صحاح ستہ کا یہ اعراض ہی یہ باور کرانے کے لیے کافی ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ورنہ امت اسلامیہ کے اجلہ محدثین جو نبی اکرم ﷺ سے منسوب ہر ایک لمحے کو صفحات کے سینے میں منتقل کرنے کے لیے بے چین رہتے ہوں، وہ ایسی اہم ترین بات کو کیوں کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔(۱)

تیسری دلیل: واقعہ غرانیق کے حوالے سے جس قدر روایت موجود ہیں، وہ سب کی سب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ امام بزار اس روایت کو یوسف بن حماد، امیہ بن خالد، شعبہ، ابو بشر، سعید بن جبیر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے واسطے سے لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ

"و هذا الحديث، لا نعلمه يروى عن النبى صلى الله عليه وسلم باسناد متصل عنه، لا يجوز ذكره الا بهذا الاسناد......"(۲)

"ہمارے علم کے مطابق نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہوئے اس حدیث کی جو بھی سند بیان کی جاتی ہے، ان میں سوائے اس کے کوئی بھی ایسی نہیں جس کا ذکر جائز ہو......"

امام طبرانی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"...... لا اعلمه الا عن بن عباس......"(۳)

"......میں اس روایت کو سوائے ابن عباس کے کسی اور سے نہیں جانتا....."

۱- دیکھیے، شفا شریف، ج:۲، ۱۰۷

۲- مسند بزار، ج:۱۱، ص:۲۹۶

۳- المعجم الکبیر، ج:۱۲، ص:۵۳

اس طرح ساری متصل روایات کی انتہا حضرت ابن عباس ﷠ پر ہی ہو رہی ہے۔ اور دوسری اسناد سے یہ روایت مروی ہے بھی تو اس کی حیثیت مرسل روایات کی ہے، جو اس قدر بڑے مسئلے کے حوالے سے قابل اعتنا نہیں۔

اچھا پھر متذکرہ بالا واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کی تاریخ ماقبل ہجرت سے جوڑی جاتی ہے اور تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہے کہ اس وقت حضرت ابن عباس کی عمر شریف محض تین سال کی تھی۔ غور طلب امر یہ ہے کہ کیا دو تین سال کے بچے سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس طرح کی روایت بیان کرے؟ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ روایت ان سے نہیں ہے، بلکہ کسی نے اپنی طرف سے گھڑ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہے۔

ایک شبہہ کا اِزالہ:

کبار ائمہ محدثین نے اس روایت کو رد کر دیا ہے۔ ان میں امام ابو منصور ماتریدی، امام بیہقی، قاضی عیاض، علامہ نووی، علامہ بدرالدین عینی، علامہ ابوبکر بن العربی، علامہ قسطلانی اور علامہ کرمانی وغیرہم کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح ائمہ مفسرین نے بھی اسے زبردست تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان میں قاضی بیضاوی، امام نسفی، امام رازی اور امام آلوسی کے اسما خصوصیت کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نگاہ رہے کہ دنیائے اسلام کے معتمد علمائے کرام میں سے صرف امام ابن حجر عسقلانی اور علامہ کورانی نے اس روایت کو ایک جہت سے تسلیم کیا ہے اور اس کی تاویل کی ہے۔ امام ابن حجر عسقلانی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سوائے حضرت سعید بن جبیر کے واسطے کے اس حوالے سے ساری کی ساری روایات یا تو ضعیف ہیں یا منقطع ہیں، لیکن جب مختلف

طرق کے ساتھ مذکور ہیں، تو اس واقعہ میں کوئی نہ کوئی صداقت ضرور ہے۔ کوئی شک نہیں اصول حدیث کے ضابطے کے آئینے میں امام ابن حجر عسقلانی کی بات میں دم ضرور ہے، لیکن یہ بھی تو دیکھ لیا جائے کہ حضرت سعید بن جبیر کے واسطے سے جو روایات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچ رہی ہیں، وہ آخر کس نوعیت کی ہیں اور ممکنات سے بھی ہیں یا نہیں۔ پچھلے صفحے میں یہ بات گزر گئی کہ واقعہ کے ظہور کے وقت حضرت ابن عباس کی عمر مبارک دو تین سال کی رہی ہوگی اور اس عمر میں اتنے بڑے واقعے کی روایت کسی بچے سے ممکن نہیں۔ ہاں اگر حضرت ابن عباس اپنی مذکورہ بالا روایت کو کسی اپنے سے بڑی عمر کے کسی دوسرے صحابی سے منسوب کرتے تو واقعی بات تشویش ناک ہوتی اور امام ابن حجر عسقلانی کی رائے صائب کہلاتی۔(۱)

عقلیات سے:

زیر بحث عنوان پر قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں تردیدی دلائل و براہین اور شواہد و قرائن سماعت کر لینے کے بعد آیئے ذرا عقلی پیمانے پر بھی اسے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تا کہ کوئی پہلو تشنہ وضاحت نہ رہ جائے۔

پہلی دلیل: واقعہ غرانیق کے حوالے سے مذکورہ روایت میں اس بات کی تصریح ہے کہ اسی شب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اتری اور اللہ نے دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اسی طرح سابقہ انبیائے کرام کے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے۔ روایت واقعہ میں القائے شیطان کی جو بات کہی جا رہی ہے اس کا تعلق سورۂ نجم سے ہے اور وہ مکی ہے، جب کہ دلاسہ دینے والی آیت کریمہ مدنی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ روایت آپ ہی کس قدر متناقض ہے؟

۱- دیکھیے، فتح الباری، ج:۹، ص:۳۶۷

یعنی من گھڑت واقعہ کو عین حقیقت بنانے کے لیے جو تانے بانے بنے گئے، وہ بھی ایسے نکلے جن میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہی محال ہے۔ اگر بفرض محال اسے تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کرلیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ واقعہ غرانیق صبح میں ہوا ہے اور وہ شام ہوتے ہوتے مدینے کی وادی میں پہنچ گئے ہیں۔ اور بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ امر معتمد تاریخی حقائق وشواہد کے سرے سے خلاف ہے۔

دوسری دلیل: بہت ممکن ہے کہ کوئی یہ کہہ دے کہ سابقہ روایت میں تردیدی وحی اترنے کے حوالے سے ''اسی شام'' کے کلمات حقیقی واقعہ کے پس منظر میں نہ ہوں، بلکہ بیانیہ پیرایہ میں ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح کے کلمات کو فحوائے بیانیہ قرار دیا جائے تاکہ متذکرہ بالا تناقض ختم ہوجائے۔ میں کہوں گا کہ یہ تشریح ایک دوسری مصیبت کھڑی کردے گی، جو پہلے تناقض سے کسی طور کم نہیں۔ وہ یہ کہ اگر اس توجیہ کو تسلیم کرلیا جائے، تو معاذ اللہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اللہ رب العزت نے ایک خلاف واقعہ امر کی تردید کے لیے برسوں انتظار فرمایا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسے کسی طور تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

تیسری دلیل: پھر اگر اسے تسلیم کرتے ہیں کہ تردیدی بیان مدینے میں اترا ہے، تو پھر بتانے کی زحمت کی جائے کہ نبی اکرم ﷺ کو مکے سے ہجرت کی ضرورت کیوں پڑی؟ واقعہ نگاروں کے الفاظ میں جب مشرکوں نے اپنے معبودوں کے بارے میں کلمات تحسین وآفریں سننے کے بعد سجدے کرلیے، تو بہ ظاہر یہ امر دلالت کرتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے لیے مکے کا ماحول خوش گوار ہوگیا تھا، پھر حرم کعبہ کو چھوڑنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہی؟ اور پھر شب ہجرت مشرکوں کے ذریعہ قتل وخون کی سازشوں کی مناسب توجیہ بھی بیان کی جائے۔

چوتھی دلیل: اگر اللہ کی جانب سے بھیجی جانے والی وحی میں القائے شیطان کی آمیزش

تسلیم کر لی جائے، تو پھر منطقی طور پر قرآن کریم کی ہر ایک آیت مشکوک ہو جائے گی اور یہ امر قطعی باطل ہے۔

پانچ ویں دلیل: پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ کسی تصور کے اثبات کے لیے پیش کردہ دلیل کو عقلی طور پر ممکنہ تصور سے کہیں زیادہ مستحکم ہونا چاہیے۔ اور یہاں مجوزین کے امکانی تصور پر دی جانے والی دلیل بلاشبہ یقینیات سے کہیں زیادہ کم زور ہے۔ لہٰذا اسلام کے بنیادی یقینیات سے متصادم کسی بھی فکری تصورات کی عمارت ایسی لچر بنیادوں پر کھڑی نہیں کی جا سکتی۔

چھٹی دلیل: سرکار دو عالم ﷺ کی حدیث کے مطابق یہ تو ممکن ہے کہ شیطان ایک انسان کی شکل اختیار کر کے خواب میں کسی کو نظر آ جائے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ حالت خواب میں بھی وہ رسول اکرم ﷺ کی صورت اختیار کر لے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آپ کی آواز کی مشابہت کرتے ہوئے کوئی بات اس طرح کہے کہ سننے والے پر آپ کی آواز ہونے کا گمان ہو جائے؟ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ سونے والے پر اشتباہ نہیں ڈال سکتا جب کہ وہ مکلّف نہیں ہوتا ہے، تو حالت بیداری میں کسی پر کیسے اشتباہ ڈال سکتا ہے، جب کہ وہ مکلّف ہوتا ہے۔

سات ویں دلیل: روایت کردہ الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ القائے شیطان کی آمیزش کے بعد گھر واپس ہو گئے اور جب وحی آئی تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کی زبان سے شیطان نے ایسے کلمات کہلوا دیے ہیں جو وحی الٰہی کا حصہ نہیں ہیں۔ اثبات واقعہ کے حوالے سے سوچتا ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ روایت گھڑنے والوں نے یہ بھی نہیں محسوس کیا کہ جو بات ہم جیسے ناچیزوں کو عقائد حقہ سے متصادم نظر آ رہی تھی، کیا وہ غیب کی خبریں دینے والے معلم

کائنات، امام الانبیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے اوجھل رہی اور حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے بتانے کے بعد ہی اسے غلط سمجھا گیا؟ **العیاذ باللّٰہ من ذلك۔**

آٹھویں دلیل: اعلان نبوت کے بعد مکے میں دشمنان اسلام کے انسانیت سوز مظالم اور قہر وغضب کی خونچکاں داستانوں سے کون واقف نہیں؟ تاریخ اسلامی کا ایک ایک ورق اس بات کی گواہی دے گا کہ مشرکین مکہ نے پیغام اسلام کے ننھے پودے کی بیخ کنی کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایسے کشیدہ ماحول میں کیا یہ ممکن ہے کہ بہ بانگ دہل سورۂ نجم کی تلاوت حرم مکہ کے احاطے میں کی جائے اور مشرکین کھڑے سنتے رہے ہوں؟

ایک اہم بات:

مصنفہ کے ذریعہ زیر بحث لائے جانے والے موضوع کے حوالے سے آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور عقلیات کے پس منظر میں سیر حاصل گفتگو آپ نے سماعت فرمالی ہے۔ چلتے چلتے اس خدشے کا اظہار بھی کرہی دوں کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ پڑے کہ جب چند بڑے علمائے کرام کی مصنفات میں یہ واقعہ مذکور ہے تو پھر مصنفہ کے لکھنے پر اس قدر برسنے کی ضرورت کیوں ہے؟ اس حوالے سے اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک غیر جانب دار مصنفہ کے لیے اسے لکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی از حد ضروری تھا کہ وہ تصویر کے دوسرے رخ کی جانب بھی اشارہ کرتیں اور وضاحت کے ساتھ لکھتیں کہ مذکورہ بالا واقعہ کی حقیقت تسلیم کرنے والوں کی تعداد نہایت ہی قلیل ہے، جب کہ اس کی تردید کرنے والوں کی فہرست کہیں لمبی ہے۔ یقین کریں کہ اگر وہ یہ وضاحت کردیتیں تو مجھے اسے زیر بحث لانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، لیکن مصنفہ نے واقعہ

غرانیق کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ جیسے وہ نا قابل انکار شواہد وقرائن اور دلائل وبراہین سے نقش بر حجر کی طرح ثابت ہو۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں پہنچ کر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ مغرب میں اسلام کے حوالے سے لکھی جانے والی مصنفات کی فہرست میں ایسی کتابیں بہت کم ملیں گی، جنہیں واقعی غیر جانب دارانہ دستاویز کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

عقیدۂ عصمت رسالت:

مصنفہ نے زیر بحث موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انبیاء کرام کی عصمت پر بھی رکیک حملہ کیا ہے اور غضب یہ ہے کہ اسے خدائے وحدہ لاشریک کی طرف منسوب کردیا ہے۔ عصمت نبوت کے حوالے سے گفتگو کرنے سے پہلے وہ آیت کریمہ ملاحظہ فرمالیں، جس کا ترجمہ کرتے ہوئے مصنفہ نے ''شیطانی غلطی'' کی نسبت انبیائے کرام سے کی ہے۔

''وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ''(۱)

''ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول یا نبی بھیجے سب کے ساتھ کبھی نہ کبھی یہ واقعہ ضرور گزرا ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم کی اصلاح وہدایت کی آرزو کی تو شیطان نے لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈال کر ایفائے آرزو میں رخنہ ڈال دیا۔'' (فیضان القرآن)

خدارا غیر جانب داری کے ساتھ ایک بار پھر متذکرہ آیت کریمہ پر نگاہ انصاف ڈالیے اور اپنے ضمیر کی آواز سننے کی کوشش کیجیے۔ کیا مصنفہ کی ترجمانی اور آیت قرآن

۱- القرآن الکریم، سورت:۲۲، آیت:۵۲

کے مفہوم میں کوئی مطابقت دکھائی دے رہی ہے؟ وہ کہتی ہیں ”سارے انبیا نے شیطانی غلطی کی ہے“ اور اسے اللہ کی آیت کی طرف منسوب بھی کر رہی ہیں، جب کہ آیت کریمہ سے ایسی کسی بات کی جانب اشارہ تک نہیں ہے۔

دوسری جانب عقیدۂ عصمت نبوت ہمارے دینی مسلمات میں سے ہے، جس کے ساتھ مصالحت کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ بات نکلی ہے تو اس حوالے سے چند دلائل و شواہد بھی سنتے چلیں، تا کہ کوئی بات بے بنیاد نہ رہ جائے۔

پہلی دلیل: اللہ رب العزت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

”قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ، قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ“ (۱)

”ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ بے شک میں تمہیں لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں، ابراہیم نے عرض کیا کہ اور جو میری نسل میں سے ہوگا ان کی نسبت کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں گے ان کا میرے اس عہد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ (فیضان القرآن)

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ گناہ کرنے والوں کو پیشوائی کے منصب جلیلہ پر فائز نہ کیے جانے کے حوالے سے کس قدر صراحت کے ساتھ اعلان کیا جا رہا ہے۔ کیا اس حقیقت سے یہ بات اظہر من الشمس نہیں ہو جاتی کہ جتنے بھی انبیائے کرام ہیں، ان سے معصیت کا صدور نہیں ہو سکتا۔

دوسری دلیل: انبیائے کرام کی بعثت ہی اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی اطاعت و فرماں برداری کی جائے۔ اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے کہ

۱- القرآن الکریم، سورت: ۲، آیت: ۱۲۴

"وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ" (۱)

"ہم نے جتنے رسول بھیجے وہ صرف اس لیے تا کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت و فرماں برداری کی جائے۔"

انبیائے کرام کی وجہ بعثت کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ امتیں اپنے اپنے رسولوں کی اطاعت کریں۔ اب اگر انبیائے کرام سے معصیت کا صدور ہو جائے تو لازم آئے گا کہ ان کی ممکنہ معصیت میں بھی امت ان کی اطاعت کرے اور یہ امر خدائے حکیم و دانا سے ممکن نہیں کہ وہ ہمیں معصیت کرنے کا حکم دے گا۔

تیسری دلیل: ابھی ابھی یہ بات گزر چکی۔ ہے کہ انبیائے کرام امتوں کی راہنمائی کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں۔ اب اگر ان سے بھی معصیت صادر ہو جائے، تو لازم آئے گا کہ ان کی بھی راہنمائی کے لیے کوئی دوسرا پیغمبر مبعوث کیا جائے اور اس طرح ایک پیغمبر کی راہنمائی کے لیے دوسرا اور دوسرے کے لیے تیسرا، پھر اس سلسلے کو بلا توقف جاری رکھنا ضروری ہو جائے گا۔ یہی چیز منطقیوں کی اصطلاح میں دَوْر سے تعبیر کی جاتی ہے، جو بلا شبہ باطل ہے۔

چوتھی دلیل: چوں کہ انبیائے کرام کی اطاعت کرنا ضروری ہے اور جب ان سے بھی معصیت صادر ہو جائے، تو پھر وہ معتمد نہیں سمجھے جائیں گے اور یہ بات کہنے کی نہیں کہ انسان جن پر اعتماد نہیں کرتا، ان کی اطاعت نہیں کر سکتا۔

پانچ ویں دلیل: اگر ان سے صدور معصیت ہو جائے، تو لوگ انہیں تنقید کا نشانہ بنائیں گے اور یوں مقصد بعثت ہی فوت ہو جائے گا۔

چھٹی دلیل: ایک نبی سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عدل و انصاف قائم کرے۔ اب جب وہ خود ہی ارتکاب خطا کی وجہ سے عدل و انصاف کے راستے سے منحرف

۱- قرآن کریم، سورت: ۴، آیت: ۶۴

ہو جائے، تو لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھنے کی نصیحت کیسے کی جا سکے گی۔

ساتویں دلیل: انبیائے کرام اپنی امتوں کے لیے نگراں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جس کی نگرانی کی جارہی ہو، اس کے مقابلے میں ایک نگراں کی معصیت زیادہ معیوب سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی امت کے مقابلے میں کہیں زیادہ معیوب قرار دیے جائیں گے۔ یوں مسند نبوت کی پاکیزگی و شرافت، قار و تمکنت اور مقام و مرتبہ مجروح ہو جائے گا۔

آٹھویں دلیل: یہ بات طے شدہ ہے کہ جسے بڑی ذمہ داری دی جاتی ہے، اس سے مؤاخذہ بھی اسی قدر سخت کیا جاتا ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ اللہ رب العزت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے حوالے سے فرماتا ہے کہ

"یَا نِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ" (۱)

"اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔" (فیضان القرآن)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے کہ

"یَا نِسَاءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ، یُضَاعَفْ لَھَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ" (۲)

"اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی ہوئی معصیت کی مرتکب ہوئی، تو اس پر اوروں سے دہرا عذاب ہوگا، اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔" (فیضان القرآن)

متذکرہ بالا دونوں آیات خموش اشارے کر رہی ہیں کہ اگر انبیائے کرام سے

۱- القرآن الکریم، سورت: ۳۳، آیت: ۳۲

۲- القرآن الکریم، سورت: ۳۳، آیت: ۳۰

معصیت ہوجائے، تو وہ دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مستحق عذاب وسزا ٹھہرائے جائیں گے اور یہ بات کسی طور مناسب نہیں۔

نویں دلیل: اس میں کوئی شک نہیں کہ معصیت شیطان کے بہکانے کی وجہ سے ہوتی ہے اور شیطان کی سازشوں سے اللہ والے پوری طرح محفوظ رہتے ہیں، اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ شیطان کو راندۂ درگاہ کررہا تھا، تو اس نے قسم کھائی کہ میں تیرے مخلص بندوں کے علاوہ دوسروں کو ضرور صراط مستقیم سے دور کرتا رہوں گا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

''قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ، إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ''(۱)

''ابلیس کہنے لگا کہ مجھے تیری عزت ووجاہت کی قسم! میں ضرور ساری انسانیت کو گم راہ کرتا رہوں گا، سوائے تیرے برگزیدہ بندوں کے۔''

(فیضان القرآن)

دس ویں دلیل: بلاشبہ انبیائے کرام ملائکہ سے افضل ہیں اور ملائکہ سے معصیت ممکن نہیں، لہٰذا اگر انبیائے کرام سے گناہوں کے صدور کی بات تسلیم کرلی جائے تو لازم آئے گا کہ ملائکہ انبیائے کرام سے اس پس منظر میں آگے ہوجائیں۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ انبیائے کرام سے گناہ نہیں ہوسکتے۔

گیارھویں دلیل: قیامت کے دن نبی مکرم ﷺ اپنی امت پر گواہی دیں گے۔ قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں:

''وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا''(۲)

۱- القرآن الکریم، سورت:۳۸، آیت:۸۳

۲- القرآن الکریم، سورت:۲، آیت:۱۴۳

"اور رسول تمہارے اعمال پر گواہ ہیں۔" (فیضان القرآن)

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نگاہ رہے کہ کسی فاسق کی شہادت بغیر تحقیق کے قابل قبول نہیں ہوتی۔

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا" (۱)

"اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے، تو خوب اچھی طرح تحقیق کرلو!" (فیضان القرآن)

اور اس امر میں اجماع ہے کہ انبیائے کرام کی شہادت بغیر تحقیق کے قابل قبول ہے، لہٰذا اگر ان سے گناہ ہو جائے تو لازم آئے گا کہ ان کی شہادت بھی بغیر تحقیق کے قبول نہ کی جائے۔ اور یہ بات تو دنیاوی اعتبار سے ہے، پھر مذکورہ بالا آیت میں بارگاہ الٰہی میں شہادت دینا تو اس سے بڑھ کر ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ انبیائے کرام سے معصیت کا صدور ہو جائے۔

بارھویں دلیل: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" (۲)

"کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو فراموش کیے بیٹھے ہو، حالاں کہ تم آسمانی صحیفہ بھی پڑھتے ہو! کیا اتنا واضح تناقض بھی تمہارے شعور و آگہی کی گرفت سے باہر ہے؟" (فیضان القرآن)

آپ محسوس کر رہے ہیں کہ قرآن کریم ایسے لوگوں کی مذمت کر رہا ہے جو دوسروں کو بھلائی کا حکم دیں اور اپنے آپ کو فراموش کیے رہیں۔ لہٰذا اگر انبیائے کرام

۱۔ القرآن الکریم، سورت ۴۹، آیت:۶

۲۔ القرآن الکریم، سورت ۲، آیت:۴۴

سے گناہ سرزد ہو جائے تو ماننا پڑے گا کہ وہ بھی قابل مذمت ٹھہرائے جائیں اور یہ بات منصب نبوت کے وقار و تمکنت اور شرافت و بزرگی کے منافی ہے۔

تیرھویں دلیل: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یمن سے گرد و غبار میں اٹا ہوا سونا بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سونے کو چار آدمیوں میں تقسیم فرما دیا، اقرع بن حابس الحنظلی، عیینہ بن بدر الفزازی اور علقمہ بن علاثہ عامری، پھر بنو کلاب کے ایک شخص اور زید خیر طائی کو، پھر بنی نبہان کے ایک شخص کو، راوی کہتے ہیں کہ یہ دیکھ کر قریش ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ حضور نجد کے سرداروں کو دے رہے ہیں اور ہمیں نظر انداز کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ صرف ان کے تالیف قلوب کے لیے کیا ہے۔ اسی درمیان ایک شخص آیا جس کی داڑھی گھنی، گال ابھرے ہوئے اور آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور کہنے لگا:

”اتق اللہ یا محمد، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: فمن یطع اللہ ان عصیتہ، ایأمننی علی اھل الارض و لا تأمنونی...“(۱)

”اے محمد! اللہ سے ڈرو، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو پھر اس کی اطاعت کون کرے گا، اللہ تعالیٰ نے مجھے زمین پر امین بنا کر بھیجا ہے اور تم مجھے امین نہیں سمجھتے......“

ذرا دیکھیے تو سہی کہ کس عزم و ثبات کے ساتھ مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو پھر اس کی اطاعت اور کون کرے گا۔ ایمان و یقین کے نورانی آبشار میں ڈوب کر اسے بار بار پڑھیے کہ یہ عبارت صاف گواہی دے

۱- مسلم، ج:۷، ص:۱۳۵

رہی ہے کہ انبیائے کرام سے گناہ سرزد نہیں ہوتے۔

ایک شبہہ کا ازالہ:

عصمت انبیائے کرام کے حوالے سے چند دلائل و براہین اختصار کے ساتھ آپ کی ذوق بصارت تک پہنچانے کے بعد، ایک شبہے کا ازالہ نہایت ضروری ہے تاکہ موضوع گفتگو ہر ایک زاویے سے آفتاب تابندہ کی طرح پورے اجالے میں آجائے۔ یہ سچ ہے کہ کبار علمائے اسلام کے نزدیک عصمت انبیا کے بارے میں نظریاتی اختلافات ہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ ان سے صدور معصیت ممکن ہی نہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ صدور معصیت ممکن بالذات تو ہے، لیکن ممتنع بالغیر ہے، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ انبیائے کرام اپنے زمانہ نبوت میں مطلقاً گناہ کبیرہ سے اور عمداً صغیرہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ بہ ہر حال توجہ طلب امر یہ ہے کہ کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ انبیائے کرام سے گناہ صادر ہوئے ہیں۔ یعنی ہزار فکری اختلافات اور نظریاتی مشاجرات کے اس بات پر اجماع امت ہے کہ انبیائے کرام سے گناہ صادر ہی نہیں ہوئے۔ اب ذرا متذکرہ مصنفہ کی زہر میں ڈوبی ہوئی دل آزار عبارت پر نگاہ ڈالیے کہ انہوں نے صدور گناہ کے امکانات پر گفتگو نہیں کی ہے، بلکہ بھٹکے ہوئے قلم کی ایک ہی جنبش سے تمام انبیائے کرام کو گناہگار ثابت کر دیا ہے۔ اور یہ بات کہنے کی نہیں کہ انبیائے کرام سے صدور معصیت کے اثبات کے بعد مذہب اسلام اپنے مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا۔

×××

حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ

آگے چل کر کیرن آرمسٹرانگ نے حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کے واقعے سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"Muhammad had been so absorbed in a discussion with some of the Meccan grandees that he impatiently 'frowned and turned away' when a blind man approached him with a question. God reproved Muhammad severely; a prophet must approach all members of the community with the same respect. He must move beyond the aristocratic ethos of muruwah: the Quran was for rich and poor alike. In brushing the blind man aside as though he did not matter, Muhammad had behaved like a kafir."(1)

۱- زیر بحث کتاب، ص:۷۸

"حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رُؤسائے مکہ کے ساتھ گفتگو میں اس قدر مستغرق تھے کہ ایک نابینا کے سوال پوچھنے پر آپ نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سخت عتاب فرمایا کہ ایک پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوم کے سارے افراد کے ساتھ یکساں احترام پر مبنی سلوک کریں۔ انہیں مروجہ رئیسانہ طریقے سے بڑھ کر مروت کا مظاہرہ کرنا چاہیے کہ قرآن امیر و غریب دونوں کے لیے ہے۔ ایک نابینا سے غیر ارادی طور پر ہی سہی، منہ موڑ کر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک کافر جیسا سلوک کیا تھا۔" (استغفر اللہ)

مصنفہ کی متذکرہ بالا تحریر کے حوالے سے کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس واقعے کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے، جسے بنیاد بنا کر مصنفہ نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔

واقعہ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ:

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں رُؤسائے قریش حاضر تھے، جن میں عتبہ، شیبہ، پسران ربیعہ، ابو جہل، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ شامل تھے۔ آپ انہیں دعوت اسلام دے رہے تھے کہ اتنے میں حضرت ابن مکتوم چلے آئے اور آداب مجلس کی رعایت کیے بغیر کہنے لگے کہ اے رسول خدا! اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو سکھایا ہے، اس میں سے مجھے بھی کچھ سکھائیے اور پڑھ کر سنائیے۔ دوران دعوت و تبلیغ حضرت ابن مکتوم کی یہ دخل اندازی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گزری اور ناپسندیدگی کے آثار چہرۂ مبارک پر عیاں ہو گئے۔ اس وقت آیات قرآنیہ نازل ہوئیں اور اللہ رب العزت نے فرمایا:

''عَبَسَ وَ تَوَلّٰی اَنْ جَاءَ الْاَعْمٰی وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَ مَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی وَ هُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی''(۱)

''چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے اور منہ پھیر لیا، کہ تبلیغ اسلام کے حوالے سے ہونے والی گفتگو کے درمیان ان کے پاس ایک نابینا چلے آئے، اور آپ کیا جانیں شاید وہ آپ کی نصیحت سے مزید پرہیزگار ہو جاتے، یا وہ نصیحت سنے، تو اسے نصیحت فائدہ پہنچاتی، لیکن وہ جو اسلام سے بالکل بے پرواہے، تو آپ تبلیغ اسلام کے لیے اس کے در پے ہیں، حالاں کہ اگر وہ نہ بھی سدھرے، تو آپ پر کوئی ضرر نہیں، اور جو آپ کی خدمت میں دوڑتے ہوئے حاضر ہوا، اور وہ اپنے پروردگار سے خائف بھی ہے، تو آپ اسے اپنی نظر عنایت سے دور کرتے ہیں۔''

(فیضان القرآن)

آپ نے ملاحظہ کرلیا ہوگا کہ مصنفہ نے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ہے تو واقعی صداقت پر مبنی، لیکن پورے واقعے کو جس رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے، وہ بلاشبہ تاریخی شواہد و حقائق سے کوسوں دور ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مصنفہ نے اپنی کتاب کی ترتیب کے دوران معتمد مصادر و مراجع کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ بات ضرور محسوس کی ہوگی کہ سرکار دو عالم ﷺ شدت سے یہ خواہش کرتے تھے کہ لوگ ضلالت و گم راہی کی تاریکیوں سے نکل کر ایمان و ہدایت کے اجالے سے آشنا ہو جائیں۔ مثال کے لیے ایسے ہی ایک موقع پر نازل شدہ آیت کریمہ پر توجہ ڈالیے۔ اللہ

۱۔ القرآن الکریم، سورت: ۸۰، آیات: ۱۰۱

تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ" (۱)

"شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنی جان ہی دے بیٹھیں گے۔"

اس میں شک نہیں کہ مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے تو بس اس قدر تھا کہ وہ پیغام حق دوسروں تک پہنچا دیں، لیکن انسانیت پر شفقت و محبت کے غلبہ کی وجہ سے ہر لمحے یہی خواہش رہتی کہ لوگ صراط مستقیم پر گامزن ہو کر اپنے آپ کو عذاب جہنم سے بچالیں اور اپنے پالنہار حقیقی کے قرب سے مشرف ہو جائیں۔ اس حوالے سے تاریخ کے صفحات سے ایک نہایت ہی افسوس ناک واقعہ سماعت کر لیجیے تاکہ مدعائے کلام کے لیے ذہن کسی حد تک سازگار ہو جائے۔

سفر طائف اور جذبہ تبلیغ اسلام:

جناب ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پیغام حق کی تبلیغ کے لیے طائف تشریف لے گئے۔ یہ شہر پہلے وَجّ کے نام سے موسوم تھا، لیکن حفاظت کے پیش نظر چاروں سمت فصیل بنا دینے کی وجہ سے اسے 'طائف' کہا جانے لگا۔ طائف انواع و اقسام کے پھلوں کی کثرت اور میٹھے پانی کے چشموں کی وجہ سے سارے عرب میں بڑا ہی متمول علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ شیخ ابن اسحاق کے مطابق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سفر تن تنہا فرمایا تھا، جب کہ شیخ ابن سعد کی رائے یہ ہے کہ اس سفر میں آپ کے خادم خاص حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ طائف پہنچ کر آپ نے اپنی تبلیغی مہم کا آغاز فرمایا۔ ایک رائے یہ ہے کہ آپ نے ایک ماہ تک اور دوسری رائے کے اعتبار سے دس دنوں تک مسلسل ایک ایک گھر تک آپ پیغام حق

۱- القرآن الکریم، سورت: ۲۶، آیت: ۳

پہنچاتے رہے۔ لیکن ایک شخص کو بھی قبولیت حق کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ اسی دوران آپ ﷺ طائف کے تینوں سرداروں، عبدیالیل بن عمرو، مسعود بن عمرو اور حبیب بن عمرو کے پاس بھی گئے۔ یہ تینوں آپس میں ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تینوں بھائیوں نے دعوت حق کے جواب میں بڑے ہی گستاخانہ کلمات کہے۔ ایک نے کہا کہ اگر آپ کو اللہ نے منصب رسالت پر فائز کر دیا ہے تو گویا میں غلاف کعبہ کو پارہ پارہ کر رہا ہوں، دوسرے نے کہا کہ کیا اللہ کو تمہارے علاوہ کوئی دوسرا نہ ملا کہ جسے وہ رسول بنا کر مبعوث کرتا، اور تیسرے نے دریدہ دہنی کرتے ہوئے کہا کہ بخدا میں آپ سے ہرگز بات نہیں کروں گا، اگر واقعی آپ اللہ کے مبعوث کردہ رسول ہیں، تو مجھ میں آپ سے بات کرنے کی سکت نہیں، اور اگر آپ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں، تو مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں آپ سے گفتگو کروں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ انداز تخاطب نہایت ہی تکلیف دہ تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان سے ایک گزارش کی کہ وہ اپنے اس سلوک کو صیغہ راز میں رکھیں اور کسی پر ظاہر نہ کریں۔ ظالموں نے یہ نصیحت بھی قبول نہ کی اور کہنے لگے کہ ہمارے علاقے سے آپ فوراً نکل جائیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے شہر کے اوباش اور نوخیز لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ لڑکے جلوس کی شکل آپ کے پیچھے پیچھے جملے کستے، پھبتیاں اُڑاتے اور اپنے بتوں کی عظمت کے نعرے لگاتے۔ ساتھ ہی ساتھ لوگوں نے پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ کچھ لوگ قدموں کو نشانہ بناتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے قدوم میمنت لزوم خون سے لت پت ہو گئے۔ یہ تکلیف دہ منظر بھی دنیا نے دیکھا کہ جب زخموں سے نڈھال ہو کر سرکار دو عالم ﷺ بیٹھ جاتے تو ظالم بازو پکڑ کر انہیں کھڑا کرتے اور پتھر برسانا شروع کر دیتے۔ (۱)

۱۔ دیکھیے، سیرت ابن کثیر: ج:۲، ص:۱۵۰

ان ناگفتہ بہ اور تکلیف دہ حالات میں سرکار دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ اور آپ کی قوم کے درمیان ہونے والی گفتگو سماعت کر لی ہے اور اپنے حکم سے میرے ساتھ پہاڑوں کی خدمت پر مامور فرشتہ بھی مبعوث کیا ہے۔ اسے ہدایت ہے کہ آپ کی مرضی کی تعمیل کرے۔ پہاڑوں کے فرشتہ نے آگے بڑھ کر سلام پیش کرنے کے بعد عرض کیا کہ اگر آپ حکم فرمائیں تو شہر کے دونوں جانب کے پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں تا کہ یہ سب ان کے درمیان پس کر رہ جائیں۔ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”بل ارجوا ان یخرج اللّٰہ من اصلابھم من یعبد اللہ وحدہ لایشرك بہ شیئا“(۱)

”بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسی اولاد پیدا فرمائے گا جو خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنایا جائے گا۔“

اب ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر شروع سے آخر تک متذکرہ واقعہ کا ایک ایک لمحہ نگاہوں کے سامنے لائیے اور پھر معلم کائنات رحمت دو عالم ﷺ کے ارشاد مقدس پر توجہ دیجیے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ عام حالات میں بھی کوئی اپنے دشمنوں کو معاف نہیں کرتا، اور یہاں تو حالات و کوائف چیخ چیخ کر گواہی دے رہے ہیں کہ ظالموں نے نہ صرف آپ کی حوصلہ شکنی کی ہے، بلکہ سرکار دو عالم ﷺ کی عزت و وقار، پاکیزگی و طہارت اور سادگی و شرافت کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفر طائف میں سرکشوں نے روحانی اور جسمانی دونوں اعتبار سے انہیں اذیت پہنچائی ہے۔

۱- بخاری، ج:۳، ص:۱۱۸۰

یہی وجہ ہے کہ سفر طائف سے واپسی پر جس طرح کے تکلیف دہ لمحات گزرے ہیں، وہ آپ کی حیات طیبہ میں سب سے زیادہ سخت اور مشکل ترین کہے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا غزوۂ احد سے بھی زیادہ مشکل وقت آپ پر کوئی اور گزرا ہے؟ آپ فرماتے ہیں کہ ہاں جب کہ میں پیغام حق کی تبلیغ کے بعد طائف سے واپس آ رہا تھا۔(۱)

جسمانی اور روحانی تکالیف سے گزرنے کے باوجود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑوں کی نگہ داشت پر متعین فرشتہ کی گزارش کا جواب دیتے ہوئے جو کلمات استعمال کیے ہیں، ان سے یہ بات آفتاب نیم روز کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انہیں ہر وقت یہی خواہش رہتی تھی کہ لوگ پیغام اسلام کے آگے سر جھکا لیں۔ جواب تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں نے ان کی ایذا رسانیوں کو درگزر کر دیا ہے اور انہیں پہاڑوں تلے روندا نہ جائے، لیکن پھر اس بات کی شہادت کیسے ملتی کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم مشکل حالات میں بھی دعوت اسلام کے حوالے سے پر امید رہتے تھے۔

اچھا پھر یہ بھی تو پیش نگاہ رہے کہ اگر یہ واقعہ آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ واقعہ ہے، تو ایسے واقعہ کے نتیجے میں زبان مبارک سے نکلنے والے کلمات بھی تو ایسے ہوں گے جنہیں حیات مستعار کے مرکزی نقطے کی جھلک سے تعبیر کیا جائے۔ یہاں پہنچ کر مدعائے کلام بالکل صاف ہو گیا ہے کہ جب مشکل ترین حالات میں بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مقصد اولیٰ سے وابستگی ایک لمحے کے لیے بھی دور نہ ہو سکی، تو پھر دوران تبلیغ اسلام کسی کے مخل ہونے کی وجہ سے چہرہ مقدسہ پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہو جائیں تو حیرت کیسی؟

بس یہی وہ جذبہ صادقہ تھا جس کی وجہ سے حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کے سوال

۱- دیکھیے، مسلم، ج:۱۲، ص:۱۲۵

پوچھنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چیں بہ جبیں ہو گئے۔ اب دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ مصنفہ نے اسے جس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب اس لیے کیا کہ وہ مکہ کے رؤسا کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے اور ایسے وقت میں ایک عام انسان کی آمد انہیں بھلی نہ لگی۔ معاذ اللہ من ذالک۔ کہاں تبلیغ اسلام میں انہماک کے جذبات اور کہاں طبقاتی کشمکش کی جھلک؟ یہ کہنے کی بات نہیں کہ دونوں عوامل میں کس قدر بعد و تناقض ہے؟

اچھا پھر یہ بھی دیکھیے کہ ایک خلاف واقعہ داعیہ کے اثبات کے لیے مصنفہ نے تانے بانے بھی خوب اکٹھے کیے ہیں اور اسے من گھڑت تعبیرات سے اس قدر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے کہ جیسے بس یہی "بنیادی داعیہ" بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عتاب نازل فرمایا کہ ایک پیغمبر سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سب کے ساتھ ایک طرح کے سلوک کریں۔

قرآن اور احادیث کے صفحات پوری توجہ کے ساتھ چھان ماریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو مصنفہ کی فکری تائید کے لیے کوئی ایک عبارت بھی نہیں مل سکتی کہ یہ سرتاسر بہتان تراشی، ذہنی بیماری اور فکری عیاری کی ناپاک اپج ہے۔

ایک اور بے بنیاد اِلزام:

مصنفہ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اختتامی کلمات میں جو الزام عائد کیا ہے، وہ نہایت ہی تکلیف دہ اور قابل مذمت ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ایک معذور شخص کے سوال پوچھنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِظہارِ ناگواری کر کے ایک کافر کی طرح سلوک کیا تھا۔ یہ بات کہنے کی نہیں کہ ایک رسول خدا کے ساتھ یہ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ جس سے محاذ آرائی کے لیے اس کی بعثت ہوئی ہو، اُس پر انہیں کے طریقے اپنانے

کے الزامات عائد کر دیے جائیں۔

یہ جان کر حیرت دو چند ہو جاتی ہے کہ مصنفہ نے اتنے بڑے الزام کی بنیادوں کی طرف کوئی اشارے بھی نہیں کیے ہیں، جب کہ تذکرہ نگاروں کے لیے یہ بات لازم سمجھی جاتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہیں، اس کے لیے کوئی نہ کوئی مستحکم بنیاد ضرور ہونی چاہیے، تاکہ کتاب کی موثوقیت و مرجعیت پر کلام کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ویسے تو مجھے یقین کامل ہے کہ قیامت کی صبح تک کسی بھی غیر جانب دار وقائع نگار کو اس حوالے سے کوئی دلیل مل ہی نہیں سکتی، لیکن سورہ عبس میں کفر پر مشتمل مفہوم سے متعلق آیت پڑھتے ہوئے ممکن ہے کہ مصنفہ کسی مغالطے میں آگئی ہوں۔ اس لیے مناسب ہے کہ لگے ہاتھوں اس کی بھی وضاحت کر دی جائے۔ اسی واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے چند آیات کے بعد قرآن کہتا ہے؛

''قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ''(۱)

''منکر حق ہلاک و برباد ہو، کس قدر ناشکرا ہے؟'' (فیضان القرآن)

آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ آیت بالا میں لفظ ''اکفرہ'' مذکور ہے، جو ٹھیک اسی واقعہ کے تذکرے کے بعد آیا ہے۔ اگر آپ اس کا لغوی مفہوم بیان کریں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''انسان تباہ و برباد ہو کہ وہ کس قدر کفر کرتا ہے''۔ مفسرین کی توضیح کے مطابق یہاں ''کفر'' سے مراد ناشکری ہے۔ یعنی ایک انسان اپنے اوپر ہونے والے باران رحمت کے باوجود پیغام حق سے روگردانی کر کے اظہار ناشکری کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ آیت ان کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہو رہی ہے، جو انعامات خداوندی کے اقرار کے باوجود تعنت و سرکشی کے جذبے میں پیغام اسلام کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے تھے۔

۱۔ القرآن الکریم، سورت:۸۰، آیت:۱۷

اس حقیقت سے کسے انکار ہے کہ قرآن مقدس دنیائے علم و حکمت میں پائی جانے والی دیگر کتابوں کے اسالیب سے یکسر مختلف ہے، وہ بغیر کسی تمہید کے ایک آیت میں کبھی کسی قوم پر آنے والی لرزہ خیز ہلاکتوں کی تصویر کشی کرتا ہے، کبھی انبیائے کرام کی دعوت و تبلیغ کے تذکرے شروع کر دیتا ہے، تو دوسرے لمحے انسانیت کو پیغام حق کی قبولیت کی دعوت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہاں یہ ضرور کہ ان سب حالات میں وہ کبھی بھی اپنے مقصد اولیٰ سے دور نہیں ہوتا اور وہ ہے، ضلالت و گم راہی کی تردید اور ایمان و یقین کی توثیق۔

بہ ہر کیف میں عرض کر رہا تھا کہ متذکرہ بالا آیات قرآنیہ میں بھی گفتگو حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ہو رہی تھی کہ اتنے میں فرشتوں کی توصیف و تعریف ہونے لگی، پھر بات کفار و مشرکین کے کفران نعمت کے بارے میں شروع ہو گئی اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

آیاتِ قرآنیہ کی مناسب توجیہ:

جب واقعہ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ آپ کے علم میں آ ہی گیا ہے، تو میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلاف کرام، معتمد محققین اور علمائے مفسرین کی پیش کردہ تفصیلات کے آئینے میں متذکرہ بالا آیات کی ایک مناسب توجیہ بھی پیش کر دی جائے، تاکہ حقانیت پوری طرح اجالے میں آجائے۔

یہ درست ہے کہ علمائے مفسرین کے نزدیک ان کی توجیہات میں قدرے اختلافات ہیں، لیکن سب کے سب اس حوالے سے متفق ہیں کہ ان سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص شان کسی طور ثابت نہیں کی جا سکتی ہے۔ امام قرطبی، امام رازی، امام اسمٰعیل حقی اور امام ابو منصور ماتریدی وغیرہم نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ سرکار

دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چیں بہ جبیں ہونا، صرف اس لیے تھا کہ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ اسلام لا چکے تھے اور آپ جنہیں پیغام حق سنا رہے تھے، وہ حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ تفہیم اسلام کے مقابلے میں تبلیغ اسلام کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس لیے آپ کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہو گئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن یہاں پر یہ سوال تشنہ وضاحت رہ جاتا ہے کہ جب حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کی دخل اندازی درست نہ تھی تو پھر ان آیات میں موضوع سخن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کیوں ہے؟ امام رازی نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے، اسے شیخ پیر کوم شاہ ازہری نے اجمال کے ساتھ بڑے اچھوتے اسلوب بیان میں قلم بند کیا ہے۔ آپ اسے انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"عتاب کی اس کے بغیر اور کوئی حکمت نہیں کہ وہ کفار جو اس وقت حاضر تھے، وہ مکہ کے سردار اور دولت مند لوگ تھے، انہیں اپنی اس برتری کا احساس بھی تھا اور اس پر انہیں گھمنڈ بھی تھا۔ ان کی موجودگی میں اپنے کسی نیاز مند کے ساتھ یہ بے اعتنائی عام لوگوں کو اس غلط فہمی میں بآسانی مبتلا کر سکتی تھی کہ یہ بے رخی، تبلیغ میں انہماک کی وجہ سے نہیں برتی گئی، بلکہ محض ان لوگوں کی دولت وثروت اور ان کی ریاست کی وجہ سے ان کی پاس داری کی گئی ہے اور عبد اللہ کو محض اس لیے نظر انداز کیا گیا ہے کہ یہ غریب عوام کا ایک فرد ہے، اور جس نبی کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہی غریب نواز بنا کر ہو، جس کا مقصد اولین ہی شکستہ دلوں اور غمزدوں کی دل جوئی اور دل داری ہو اور جو تشریف ہی اس لیے لایا ہو کہ فقراء ومساکین کی عزت افزائی کرے، اس ہستی سے کسی ایسی بات کا صدور جس سے اس کے منصب رفیع کے خلاف کوئی واہمہ پیدا ہو سکے، اللہ تعالیٰ کو ہرگز گوارا

نہیں۔"(۱)

عتابِ الٰہی کی توجیہ:

کبار مفسرین نے آیات متذکرہ کی وضاحت کرتے ہوئے عام طور پر لکھا ہے کہ ان میں سرکار دو عالم ﷺ پر اللہ نے عتاب فرمایا ہے اور دلیل کے لیے ایک روایت نقل کرتے ہیں، جس کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

"مرحبا بما عاتبنی ربی لاجله"(۲)

"سرکارِ دو عالم ﷺ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کا اکرام فرماتے ہوئے کہتے کہ خوش آمدید ہو کہ جس کے لیے میرے پروردگار نے مجھ پر عتاب فرمایا۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا حدیث کسی بھی صحیح یا مستند روایت کے ساتھ کسی حدیث کی کتاب میں موجود نہیں ہے، لیکن اس کثرت کے ساتھ مفسرین نے اسے لکھا ہے کہ لوگوں نے اسے مستند تسلیم کر لیا ہے۔ ہاں اس سے ملتی جلتی ایک روایت حضرت مسلم بن صُبیح بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں گئے، تو دیکھا کہ ان کے پاس ایک نابینا بیٹھے تھے اور وہ انہیں لیموں شہد میں ڈبو کر دے رہی تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ امّ المومنین یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"هذا ابن مکتوم الذی عاتب الله تبارك و تعالٰی فیه نبیه"(۳)

"یہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں جن کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے

۱- ضیاء القرآن، ج:۵، ص:۴۹۱

۲- التحریر والتنویر، ج:۳۰، ص:۱۰۸، تفسیر رازی، ج:۳۱، ص:۵۴، قرطبی، ج:۱۹، ص:۲۱۱، جلالین، ج:۱، ص:۷۸۴، کشاف، ج:۴، ص:۲۱۷ وغیرہ

۳- مستدرک للحاکم، ج:۳، ص:۳۵

نبی پر عتاب فرمایا۔"

اس میں شک نہیں کہ حضرت مسلم بن صُبیح رحمۃ اللہ علیہ، مسلم، مسند احمد، دارمی، ترمذی، نسائی، طبرانی اور بیہقی وغیرہم کے اصحاب رجال میں سے ہیں، لہٰذا ان کے ثقہ ہونے پر کلام نہیں ہے، لیکن یہ روایت مرفوع نہیں کہلائے گی، بلکہ مراسیل کے خانے میں رکھی جائے گی۔ بہ ہر کیف بہ شرطِ صحت روایت میرے نزدیک عتاب الٰہی کی سب سے مناسب توجیہ یہ ہے کہ ان کلمات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کمال لطف و محبت کے ساتھ اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت فرمائی ہے۔

×××

عمومی نبوت

طائف سے واپسی پر سرکار دو عالم ﷺ دوران نماز قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے، کہ اتنے میں گروہ جن ادھر آ نکلے اور جب برگزیدہ مفاہیم و معانی پر مشتمل قرآنی آیات کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو خوش گوار حیرت سے دو چار ہو گئے۔ اس واقعے سے استدلال کرتے ہوئے مصنفہ کہتی ہیں کہ بہ ظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جن یہودی مذہب پر قائم ہوں، جنھوں نے اپنی قوم کے درمیان واپسی پر قرآن کریم کے خوب صورت، اچھوتے اور دل کش اسلوب بیان کی پذیرائی کی۔ اس کے بعد کے کلمات خود مصنفہ کی زبانی سماعت کیجیے:

"He had been certain that he had been sent simply as a 'warner' to his own tribe and that Islam was only for the people of Mecca. But now he was beginning to look further afield to the People of the Book, who had recived earlier revelations."(۱)

"آپ (ﷺ) کو قطعی یقین تھا کہ وہ صرف اپنے قبیلے کے لیے نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اسلام صرف اہل مکہ کے لیے ہے۔ لیکن اب وہ اہل

۱۔ زیر بحث کتاب، ص: ۹۲

کتاب کے علاقے کی طرف دیکھنے لگے، جنہیں پہلے وحی کی جا چکی تھی۔"

ذرا توجہ فرمایئے کہ مصنفہ کہنا یہ چاہتی ہیں کہ ابتدائی طور پر رسول اکرم ﷺ کو یقین تھا کہ وہ صرف اہل مکہ کے لیے ہی رسول بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں، لیکن طائف سے واپسی پر گروہ جن کے ذریعہ قرآن کریم کی پذیرائی سے محسوس ہونے لگا کہ وہ صرف اہل مکہ کے لیے نہیں ہیں۔ اور یہی وسعت فکران کے مدینے کی طرف دیکھنے کا سبب بن گئی۔ اس میں شک نہیں کہ موہوم خیالات پر رسالت عامہ کی بنیاد رکھ کر مصنفہ نے اسلام کے ثابت شدہ عقائد پر نقب زنی کی کوشش کی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ پہلے انبیائے کرام اپنی اپنی امتوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے، لیکن ہمارے رسول اکرم ﷺ کی نبوت ساری انسانیت کے لیے ہے۔ اس حوالے سے چند دلائل و براہین ملاحظہ فرمایئے!

"قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَانِ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"(۱)

"آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! بلاشبہ میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں جس کے زیر نگیں آسمانوں اور زمین کی وسعتیں ہیں۔"

(فیضان القرآن)

"وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ"(۲)

"ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیا ہے۔"

(فیضان القرآن)

آپ ہاتھے کی آنکھ سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ وضاحت

۱۔ القرآن الکریم، سورت: ۷، آیت: ۱۵۸

۲۔ قرآن الکریم، سورت: ۲۱، آیت: ۱۰۷

کے ساتھ اعلان فرما رہا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی نبوت کسی ایک قوم کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ سارے لوگوں کے لیے ہے اور دوسری آیت چیخ چیخ کر گواہی دے رہی ہے کہ آپ کسی ایک علاقے کے لیے تشریف نہیں لائے، بلکہ سارے جہانوں کے لیے رحمت بن کر مبعوث ہوئے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی نہایت ضروری ہے کہ یہ آیات بالترتیب سورہ اعراف اور سورہ انبیاء سے ہیں، اور یہ دونوں سورتیں مکی ہیں۔ میں نے آپ کی نبوت عامہ کے اثبات کے لیے مدنی آیات سے جان بوجھ کر احتراز کیا ہے، تاکہ مصنفہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ان کی گفتگو کا تعلق مکی زندگی سے ہے اور مدنی زندگی میں سرکار دو عالم ﷺ کی نبوت عامہ پر آیات قرآنیہ کا نزول ان کی فکر سے متصادم نہیں۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل نے ربیعہ بن عباد رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت کے دوران ذوالمجاز کے میلے میں سرکار دو عالم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا

"یاایھا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا"(۱)

"اے لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور لائق عبادت نہیں، تاکہ فلاح پا جاؤ۔"

یہاں بھی سرکار دو عالم ﷺ کا طرزِ تخاطب بتا رہا ہے کہ وہ ساری انسانیت کے لیے ہادی و رہنما بنا کر بھیجے گئے ہیں اور کسی خاص علاقے یا قوم کے لیے محدود نہیں ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ دعوتی مصلحت کے پیش نظر ابتدا میں اسلامی تحریک پوشیدگی سے بڑھتی رہی اور رسول اکرم ﷺ سے اعزہ و اقارب کو انکار حق کے عواقب سے ڈرانے کی ہدایت دی گئی، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ شروع میں آپ کا حلقہ رسالت بھی محدود تھا، بلکہ تھے تو آپ شروع ہی سے سب کے لیے، یہ اور بات کہ پیغام حق کی تبلیغ کا دائرہ کار دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں کہ دنیا کی ہر تحریک اپنی پیدائش کے پہلے دن ہی ہر چہار سمت نہیں چھا جاتی

۱- مسند احمد، ج:۳، ص:۵۴۷

ہے، بلکہ وہ بنیادی طور پر ایک علاقے سے شروع ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ جوانی کی طرف بڑھتی ہے اور ایک دن آتا ہے کہ لوگوں کا ایک بڑا طبقہ اسے اپنی آواز سمجھنے لگتا ہے۔ بغیر کسی تمثیل کے یوں سمجھ لیں کہ اسلامی تحریک کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ پہلے مرحلے میں یہ خفیہ رہی، دوسرے مرحلے میں سرکار دو عالم ﷺ کے اعزہ واقارب تک اسے آگے بڑھایا گیا اور تیسرے مرحلے میں جب حالات کسی حد تک سازگار ہوگئے تو اسے پوری طرح عام کر دیا گیا۔ خیال رہے کہ یہ مراحل دعوت و تبلیغ کے ہیں، مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کی اصل نبوت کے نہیں۔

×××

اِسلام اہل کتاب کے لیے بھی

سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت نگاری کرتے ہوئے مصنفہ نے ایک بہت ہی عجیب وغریب بات لکھی ہے، جو نہ صرف اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہے، بلکہ زمینی حقائق اور ظاہری شواہد وقرائن کے بھی صریح خلاف ہے۔ بہتر ہے کہ یہ اچھوتی بات آپ انہیں کے لب ولہجے میں سماعت فرمائیں!

> ***" Muhammad would not have expected the Jews to convert to his religion, because they had their own revealed din. God had decreed that each community should have its own messenger. "(1)***

''محمد (ﷺ) یہودیوں سے امید نہیں رکھتے تھے کہ وہ اسلام قبول کریں گے، کیوں کہ ان کے لیے خود ان کا اپنا ایک الہامی مذہب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فیصلہ فرما دیا تھا کہ ہر قوم کے لیے ان کا ایک اپنا نبی ہے۔''

آپ نے ملاحظہ کرلیا کہ مصنفہ کس قدر صراحت کے ساتھ سرکار دو عالم ﷺ کے حوالے سے ایک بے بنیاد بات کہہ رہی ہیں اور پھر اسے قرآنی آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مدلل کرنے کی ناکام کوشش بھی کر رہی ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ بہت

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۰۸

ہی سنگین اتہام ہے، جس کی حقیقت جاننے کے لیے قرآن کے صفحات کھولیے اور عدل و انصاف کے ساتھ پڑھیے۔ آپ ایسی دسیوں آیات سے ملاقات کریں گے، جن میں نہایت ہی وضاحت کے ساتھ اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی جارہی ہے۔ موضوع کی مناسبت سے صرف چند آیات ملاحظہ فرمایئے!

''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْھًا فَنَرُدَّھَا عَلٰٓی اَدْبَارِھَآ اَوْ نَلْعَنَھُمْ کَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ، وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا'' (۱)

''اے اہل کتاب! تم سب اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو تمہاری جانب بھیجی گئی کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے، قبل اس کے کہ ہم بعض چہرے مسخ کر کے پیٹھ پیچھے پھیر دیں یا ان پر اسی طرح لعنت بھیجیں جیسا کہ ہفتہ والوں کی سرکشی پر بھیجی تھی۔ اور یاد رہے کہ اللہ کا حکم ہر قیمت پر پورا ہو کر رہتا ہے۔'' (فیضان القرآن)

''قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ'' (۲)

''اے محبوب! اہل کتاب سے کہیے کہ تم سب اللہ کی آیات کو تسلیم کیوں نہیں کرتے، حالاں کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب اللہ کے مشاہدے میں ہے۔'' (فیضان القرآن)

کیا کہنے ہیں کہ قرآن مقدس تو اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دے اور نبی اکرم ﷺ اہل کتاب کے اسلام لانے کی توقع نہ رکھیں! .... اگر کسی متصادم فہم و

۱- قرآن کریم، سورت: ۴، آیت: ۴۷

۲- قرآن کریم، سورت: ۳، آیت: ۹۸

فراست کی ہول ناکیوں کے اظہار کے لیے آسمان پھٹ پڑنے کی روایت ہوتی، تو مصنفہ کی تحریر پڑھتے ہوئے ایک نہیں کئی بار ہم اپنے ماتھے کی آنکھوں سے یہ ہیبت ناک منظر دیکھ چکے ہوتے۔ خیال رہے کہ مندرجہ بالا دونوں آیات قرآنیہ کا تعلق مدنی سورتوں سے ہے، لہٰذا زیر بحث گفتگو کے لیے بلاشبہ یہ بہترین مثالیں ہیں۔

اچھا پھر یہ ممکن ہے کہ کوئی ان آیات قرآنیہ کو محض اسلامی نکتۂ نظر سے تعبیر کرے، لہٰذا تجرباتی اعتبار سے بھی ایک جھلک دیکھتے چلیں، تا کہ یقین کامل ہو جائے کہ نہ صرف سرکار دو عالم ﷺ اہل کتاب کو دعوت اسلام دیتے رہے ہیں، بلکہ اہل کتاب کے کبار علماء قبولیت اسلام سے سرفراز بھی ہوتے رہے ہیں۔

علمائے اہل کتاب میں ایک بہت ہی نمایاں نام حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ان کے اسلام لانے کے حوالے سے وہ خود کہتے ہیں کہ جب سرکار دو عالم ﷺ کے اعلان نبوت کی بازگشت کانوں میں پڑی اور آپ کی صفات حمیدہ، اخلاق و کردار اور ظاہری محاسن کے بارے میں معلوم ہوا تو ضمیر پکار اٹھا کہ یہ وہی ہیں، جن کے ہم منتظر تھے، لیکن ہم نے اسے اپنے نہاں خانہ دل میں چھپائے رکھا۔ ایک دن جب میں کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا تھا، تو اتنے میں ایک شخص نے آپ ﷺ کے قبا تشریف لانے کی اطلاع دی۔ فرط مسرت سے میری چیخیں بلند ہو گئیں اور میری پھوپھی جو درخت کے نیچے بیٹھی تھیں، کہنے لگیں کہ اگر حضرت موسیٰ بن عمران کی آمد ہو جاتی، تو تم اس سے زیادہ اظہار مسرت نہ کر سکتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ پھوپھی جان یہ بھی انہیں کے بھائی ہیں اور یہ بھی وہی پیغام لے کر آئے ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ پھر میری پھوپھی نے کہا کہ اے بھتیجے! کیا یہ وہی نبی ہیں، جن کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا رہا ہے کہ وہ قرب قیامت تشریف لائیں گے۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ بے شک یہ وہی ہیں۔ پھر میں تیزی کے ساتھ بارگاہ نبوت میں

حاضر ہوا اور جمال جہاں آرا کی تابانیوں پر جوں ہی نظر پڑی، دل جھک گیا، آنکھیں بھر آئیں اور زبان سے کلمہ حق پڑھ کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ گھر واپسی پر میں نے اپنے اہل خانہ کو بھی اسلام کی دعوت دی اور وہ سب میری پھوپھی کے ساتھ ساتھ اسلام لے آئے۔(۱)

ایسا نہیں ہے کہ مصنفہ نے رواروی میں یہ بات کہہ دی ہو، بلکہ کتاب کے کئی مقامات پر زیر بحث رائے کی بازگشت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کسی طرح یہ رائے مصنفہ کے تلاطم خیز ذہن وفکر کا حصہ بن چکی ہے۔

مثال کے لیے اسے پڑھیے!

"Muhammad (Peace and Blessings be upon him) did not expect them to convert to Islam, and their quarrel with him was not primarily religious but political and economic.(۲)

''محمد (ﷺ) کو اہل کتاب کے اسلام لانے کی توقع نہ تھی، اور آپ کے ساتھ جو ان کے اختلافات تھے وہ مذہبی نوعیت کے نہ تھے، بلکہ محض سیاسی اور اقتصادی تھے۔''

اس حد تک تو یہ بات صحیح ہے کہ عام یہود قبائلی عصبیت اور دنیاوی وجاہت کے نشے میں اسلام کی مخالفت کرتے رہے، لیکن یہ بات درست نہیں کہ وہ دین حق کے مخاطب ہی نہ تھے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دین اسلام کی صداقت وحقانیت کے باوجود وہ اسلام کی مخالفت صرف اس لیے کر رہے تھے کہ عرب قبائل سے تعلق رکھنے والے نبی

۱- دیکھیے، سیرت ابن ہشام، ج:۲، ص:۳۷۳

۲- نفس کتاب، ص:۱۱۹

ﷺ کے تسلیم کر لینے کے بعد علاقے سے ان کے قبائل کا تسلط ختم ہو جائے گا اور معیشت و اقتصادیت کے وہ سارے حرام ذرائع بند کرنے ہوں گے، جن کے وہ خوگر ہو چکے تھے۔

اس حوالے سے وہ واقعہ سماعت کرتے چلیے جس کی چشم دید گواہ خود ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہیں، وہ کہتی ہیں کہ جب رسول اکرم ﷺ ہجرت کے بعد قبا میں قیام پذیر ہوئے، تو ایک دن حقیقت حال دریافت کرنے کے لیے صبح سویرے میرے والد اور چچا قبا کی طرف گئے۔ شام کو غروب آفتاب کے بعد بوجھل قدموں کے ساتھ وہ واپس لوٹے۔ میں بھاگتی ہوئی ان کے پاس گئی، تو میں نے اپنے والد سے چچا کو یہ پوچھتے ہوئے سنا کہ کیا یہ وہی ہیں؟ میرے والد نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہاں یہ وہی ہیں، جن کی صفات و علامات ہمیں بتائی جاتی رہی ہیں۔ میرے چچا نے کہا کہ پھر ارادہ کیا ہے؟ میرے باپ نے کہا کہ ساری زندگی ان کی مخالفت کرتا رہوں گا۔(۱)

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عام یہودیوں کی اسلام دشمنی محض دنیاوی عیش و عشرت کے پیش نظر تھی، لیکن یہ بات کسی طور قابل قبول نہیں کہ انہیں دین اسلام کے اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اور اسے بھی پیش نگاہ رکھیں کہ مصنفہ کی متذکرہ بالا رائے اسی لیے ہے کہ ان کی سمجھ کے مطابق اہل کتاب کو ضرورت ہی نہ تھی کہ اسلام قبول کریں۔ ایک دوسرے مقام پر آیت نور سے استدلال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"The olive tree signifies the continuity of revelation, which springs from one root but branches into a multitudinous variety of religious experience that cannot be confined to a single faith or locality, and is neither of

---

۱- دیکھیے، سبل الہدیٰ، ج:۳، آیت:۳۴۹

the east nor the west."(۱)

"زیتون کے درخت سے تسلسل وحی کی طرف اشارہ ہے، جس کی ابتدا تو ایک جڑ سے ہوتی ہے، لیکن شاخیں مختلف دینی تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتی ہیں، جنہیں صرف ایک مذہب یا کسی ایک علاقے تک محدود نہیں کیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی اسے مشرق اور مغرب سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔"

آسان لب ولہجے میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ مصنفہ کہنا چاہتی ہیں کہ جب سارے آسمانی ادیان ایک ہی خدا کی طرف سے اتارے گئے ہیں، تو پھر قرآنی تصریح کے مطابق ہر ایک دین کو اپنی مذہبی روایات اور شرعی احکامات کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا اہل کتاب کو حاجت ہی نہیں کہ وہ دین اسلام کی طرف دیکھے۔

بہتر ہے کہ کچھ عرض کرنے سے پہلے اس آیت کریمہ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، جس کی جانب مصنفہ نے اشارہ کیا ہے۔

"اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ، فِیْھَا مِصْبَاحٌ، اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ، اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَاشَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ، یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ، نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ"(۲)

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے، طاق میں چراغ، چراغ شیشے کے فانوس میں ہے، شیشے کا فانوس اس قدر صاف وشفاف ہے کہ یوں لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۰۰

۲- القرآن الکریم، سورت: ۲۴، آیت: ۳۵

درخشندہ وتابناک ستارہ ہو، جسے برکت والے زیتون کے درخت کے تیل سے روشن رکھا گیا ہے، جو نہ مائل بہ مشرق ہے اور نہ ہی مغرب، ایسا لگ رہا ہے کہ تیل آپ ہی آپ بھڑک اٹھے گا گرچہ اسے آگ کی چنگاری سے روشن بھی نہ کیا جائے، گویا نور بالائے نور ہے۔"

(فیضان القرآن)

اس آیت کریمہ کے مفاہیم کی وضاحت کرتے ہوئے علمائے کرام نے بہت طویل گفتگو کی ہے، ہم یہاں اجمالی طور پر صرف مشہور آرا کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱- صدر الافاضل رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ

نور سے مراد ہدایت ہے، اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ایسی ظاہر و باہر ہے کہ عالم محسوسات میں اس کی تشبیہ ایسے روشن دان سے ہوسکتی ہے، جس میں صاف وشفاف فانوس ہو، اور فانوس کے اندر ایسا چراغ ہو جو نہایت ہی بہتر اور مصفّٰی زیتون سے روشن ہو۔(۱)

۲- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے اس آیت کریمہ کا مفہوم دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ طاق سے مراد سینہ مبارک ہے، فانوس سے مراد قلب انور ہے، چراغ سے مراد نبوت ہے جو شجر نبوت سے روشن ہے۔ یعنی نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر روشن وتابندہ ہے کہ اگر آپ اپنی نبوت کا اعلان نہ بھی فرماتے جب بھی لوگوں پر خود بخود عیاں ہو جاتا۔(۲)

۳- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ طاق سینہ مبارک ہے، فانوس قلب اطہر اور

۱- خزائن العرفان، ص: ۵۱۳، حاشیہ کنز الایمان

۲- دیکھیے، تفسیر ابن کثیر، ج:۶، ص: ۵۲

چراغ وہ نور ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس میں رکھا، جو نہ مشرقی یعنی یہودی ہے اور نہ ہی مغربی یعنی نصرانی ہے، بلکہ ایک شجرہ مبارکہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات سے منسوب ہے۔(۱)

۴- حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ مومن کی مثال ہے۔ طاق سے نفس مومن، فانوس سے سینہ، مصباح سے نور ایمانی اور نور سے قرآن مقدس مراد ہے، جسے اللہ تعالیٰ مومن کے قلب میں پیدا فرماتا ہے، نیز شجرہ مبارکہ سے مراد اخلاص نیت ہے۔(۲)

۵- حضرت محمد بن کعب القرظی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فانوس سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، چراغ سے معلم کائنات سرکار دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور شجرہ مبارکہ سے حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں کہ زیادہ تر انبیائے کرام علیہم السلام انہی کے صلب سے ہیں، جو کہ نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی، بلکہ دین حنیف پر قائم تھے۔

یہ چراغ قریب ہے کہ خود بہ خود روشن ہو جائے یعنی محاسن و کمالات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی سے پہلے ہی لوگوں پر ظاہر ہو جائیں۔ اور نور بالائے نور یوں کہ نور محمدی ہے نور ابراہیمی سے۔(۳)

زیر بحث آیت کریمہ میں مذکورہ تمثیلات کے ممکنہ مفاہیم پڑھنے کے بعد کیرن آرمسٹرانگ کے ''تخلیقی ذہن'' کے پردے پر ابھرنے والے دھندلے اشارے نگاہوں کے سامنے رکھیے۔

مجھے یقین ہے کہ 'مارو گھٹنا پھوٹے سر' والی مثال حرف بہ حرف صادق آئے گی۔

۱- دیکھیے، تفسیر قرطبی، ج:۱۲، ص:۲۵۵

۲- دیکھیے، ضیاء القرآن، ج:۳، ص:۳۲۷

۳- دیکھیے، لباب التاویل فی معنی التنزیل: شیخ ابوالحسن علی بن محمد خازن، تحت آیت مذکور

دونوں قسم کی تعبیرات میں دور دور تک کوئی نسبت ہے ہی نہیں۔ یہاں بات حقانیت اسلام اور محاسن و کمالات مصطفیٰ ﷺ کی ہو رہی ہے اور مصنفہ اس آیت سے یہودیت و نصرانیت کے برحق ہونے پر استدلال کر رہی ہیں۔

اس امر سے کسے اختلاف ہے کہ یہود و نصاریٰ کی جانب بھیجے جانے والے پیغمبر بھی برحق تھے اور ان پر اترنے والی آسمانی کتابیں بھی، لیکن جب انہوں نے اپنی کتابوں میں تحریف و تبدیلی کر دی تو وہ قابل اعتبار نہ رہیں اور پھر آخری نبی کی حیثیت سے سرکار دو عالم ﷺ تشریف لے آئے تو ان کے لائے ہوئے پیغامات منسوخ ٹھہرائے گئے۔ لہٰذا اب دین سماوی کی صورت میں سوائے اسلام کے اور کوئی دوسرا مذہب روئے زمین پر ہے ہی نہیں کہ جسے دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

×××

حقائق سے چشم پوشی

آپ اگر سرسری طور پر مصنفہ کی تحریر پڑھ رہے ہیں، تو شاید اسلوب بیان میں تعصبات کی جھلک صاف نظر نہ آئے، لیکن میرے خیال میں کمال توجہ سے پڑھنے والے قاری پر یہ راز منکشف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پوری کتاب میں بیسیوں ایسے مقامات ہیں، جنہیں غیرت حق، پاس داری سخن اور حسن اظہار کی عدالت میں بہ طور اِستشہاد پیش کیا جاسکتا ہے۔ لگے ہاتھوں متذکرہ عبارت ہی کو لے لیجیے۔ انہوں نے ''پیغام اسلام'' کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ جیسے یہ بھی کوئی دنیا کی دوسری عام تحریکوں کے مثل ہو، جنہیں ابتداء میں صرف ایک خطے کے لیے سمجھا جاتا ہے، پھر جیسے جیسے جڑیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں، ذمہ داران ان کے حلقے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ دین اسلام پہلے ہی دن سے ساری انسانیت کے لیے نہیں تھا، بلکہ جوں جوں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے اس کے دائرہ کار میں بھی وسعت دی جانے لگی۔ اس طرح پیغام اسلام کی وسعت وہمہ گیریت اور توثیق الٰہی کے درمیان مضبوط و مستحکم آسمانی رشتہ ٹوٹ کر بکھر جائے اور دھیرے دھیرے یہ دین بھی ''بندوں'' کے ذریعہ بنائے گئے ادیان میں شامل ہو جائے۔

مدعائے نگارش کی وضاحت کے لیے اس سے بھی زیادہ ایک اور واضح مثال سماعت فرمائیں۔ تاریخی صفحات میں یہ بات موجود ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ حج وعمرہ کی

ادائیگی کے لیے باہر سے آنے والے لوگوں کے درمیان اسلام کی تبلیغ فرماتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب آپ عقبہ کے مقام سے گزر رہے تھے، تو دیکھا کہ مدینہ منورہ سے آئے ہوئے چند لوگ بیٹھے ہیں۔ آپ کے استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی گفتگو کے بعد سرکار دو عالم ﷺ نے پیغام حق کی وضاحت کرتے ہوئے چند آیات قرآنیہ پڑھ کر سنائیں۔ بالآخر انہیں قبولیت اسلام کی دعوت دی، جسے انہوں نے بہ سرو چشم قبول کر لیا۔(۱)

اب ذرا اس واقعہ کے ذیل میں کیرن آرمسٹرانگ کے قلم سے نکلے ہوئے چند جملے سماعت کیجیے!

"They made their formal surrender to God on the spot, with high hopes. ' We have left our people, for no tribe is so divided by hatred and rancor as they. Perhaps God will unite them through you."(۲)

"ان لوگوں نے پیغام الٰہی کے آگے اس امید کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیا کہ دوسروں کے مقابلے میں ہماری قوم سب سے زیادہ نفرت و دشمنی کی وجہ سے بٹ گئی ہے، شاید اللہ تعالیٰ آپ کے صدقے ہمیں دوبارہ متحد کر دے۔"

ذرا دیکھیے کہ یہاں بھی مصنفہ اپنی تحریر سے در پردہ یہ باور کرانا چاہتی ہیں کہ قبیلہ خزرج کے خوش قسمت لوگوں نے اس جذبے میں دین حق کو قبول نہیں کیا کہ وہ اس کی

۱- دیکھیے: سیرۃ نبویہ، زینی دحلان مکی، ج:۱، ص:۲۸۷

۲- نفس کتاب، ص:۱۰۳

صداقت، برتری اور عظمت کے قائل ہو گئے تھے، بلکہ صرف اس لیے تاکہ ان کے باہمی نزعات، اختلافات اور جنگ وجدال کا خاتمہ ہو جائے۔ یعنی وہ اپنی خوشی سے دین اسلام قبول نہیں کر رہے ہیں، بلکہ قبائلی حمیت وعصبیت کے نشے میں قتل وغارت گری سے تنگ آکر بحالت مجبوری اسے گلے لگا رہے ہیں۔

اچھا پھر بھی کوئی ایک دو مثالیں ہوتیں، تو اسے مصنفہ کے غیر ارادی صرف نظر پر محمول کرتے ہوئے درگزر کیا جا سکتا تھا، لیکن کیا کہیے کہ ایسی مثالیں کثرت سے دکھائی دیتی ہیں، بلکہ یہ کہنا حقیقت کی ترجمانی ہوگی کہ مصنفہ نے سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت پیش کرتے ہوئے ایسے واقعات سے گریز کرنے کی کوشش کی ہے، جو انہیں عام انسانوں سے ممتاز کرتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ کے طرز نگارش سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی شخصیت دنیا کے کسی انقلابی قائد جیسی تھی، جنہیں حالات سازگار میسر آئے اور وہ اپنی حکمت عملی، دور اندیشی اور جد وجہد سے ہر محاذ پر کامیاب ہو گئے۔

اس پس منظر میں مثال کے لیے سفر طائف سے واپسی پر اللہ کی جانب سے سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں پہاڑوں کی ذمہ داری پر مامور فرشتہ بھیجنے کی روایت ہے، جس کی طرف مصنفہ نے اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس واقعے سے ایک طرف تو سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ اللہ رب العزت کی بے پایاں محبت وعنایت ظاہر ہوتی ہے اور دوسری جانب آپ کے صبر وتحمل، شرافت ومروت اور رحمت وشفقت کی جھلکیاں بھی صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔

اس پس منظر میں لگے ہاتھوں چند واقعات مزید ملاحظہ فرمالیں!

شب ہجرت دشمنوں کے نرغے میں:

تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت ہے کہ شب ہجرت سرکار دو عالم ﷺ نے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سلا دیا، جب کہ دشمن باہر تلواریں لیے کھڑے تھے۔
اب ذرا مصنفہ کے قلم سے نکلے ہوئے جملے ملاحظہ فرمالیں!

"Unbeknownst to them, Muhammad had already escaped through a back window, leaving Ali lying apparently asleep, wearing his clothes."(۱)

''دشمنوں کی لاعلمی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پچھلی کھڑکی سے بھاگ نکلے، اور علی (رضی اللہ عنہ) کو اپنا لباس پہنا کر بستر پر سوتا ہوا چھوڑ گئے۔''

مجھے نہیں معلوم کہ کن تاریخی شواہد و دلائل کی بنیاد پر مصنفہ نے یہ بات کہی ہے، لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ عام سیرت کی کتابوں میں ذکر کیے گئے اسلوب بیان سے قطعی متصادم ہے۔ قابل اعتماد دستاویز بتاتے ہیں کہ شب ہجرت جب دشمنوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاروں اطراف سے اپنے نرغے میں لے لیا تھا، تو آپ پچھلی کھڑکی سے نہیں، بلکہ عام دروازے سے باہر آئے۔ پھر مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اس پر سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات تلاوت کر کے دشمنوں کی جانب پھینک دیا، اور ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے چلے گئے۔ بلاشبہ یہ معجزہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھا کہ آپ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں اور انہیں کچھ سوجھ نہیں رہا ہے۔ (۲)

ہو سکے تو مصنفہ کی عبارت پر ایک بار اور غور کر لیجیے۔ آپ میری باتوں سے صد فی صد اتفاق کریں گے کہ جو اسلوب مصنفہ نے اختیار کیا ہے، اس سے کسی عام انسان کے دشمنوں کے نرغے سے بچ نکلنے کے لیے کھڑکی سے بھاگ نکلنے کا گمان ہوتا ہے،

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۱۳

۲- دیکھیے سیرت ابن ہشام، ج: ۲، ص: ۳۰۹

جب کہ تاریخی اعتبار سے ثابت شدہ حقیقت سے عبقریت مصطفٰے ﷺ عیاں ہورہی ہے۔ اب یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے کہ مصدقہ تاریخی شہادت سے انحراف کرتے ہوئے مصنفہ نے یہ اسلوب کیوں اختیار کیا ہے؟

اسی طرح واقعہ ہجرت میں سو سرخ اونٹوں کے انعام کے اعلان پر سرکار دو عالم ﷺ کے تعاقب میں حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کے نکلنے کا تذکرہ نہیں ہے، کہ جب آپ ﷺ کے حکم پر بار باران کے گھوڑے کے پیر زمین میں دھنس جاتے ہیں اور آپ بار بار رحمت وشفقت فرماتے ہوئے اسے زمین سے کہہ کر باہر نکلوا دیتے ہیں۔ اخیر میں انہیں سرکار دو عالم ﷺ بادشاہ کسریٰ کے سونے کے کنگن پہنائے جانے کی بشارت دیتے ہیں۔ پھر راہ ہجرت میں پیش آنے والے مختلف معجزات کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں ہے۔ خیال رہے کہ آپ یہ کہہ کر جان نہیں چھڑا سکتے کہ ایک مغربی مصنفہ کی نظروں سے، بہت ممکن ہے، یہ سب باتیں اوجھل رہ گئی ہوں۔

اجازت ہو تو عرض کروں کہ اگر اس امر میں کوئی صداقت ہے تو بتایا جائے کہ صرف ایسے واقعات اور معجزات ہی نگاہوں سے پوشیدہ کیوں رہ گئے، جن سے سرکار دو عالم ﷺ کی قدر ومنزلت، طہارت وشرافت اور عظمت ورفعت ظاہر ہوتے ہیں؟ کیا یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ باریک بینی تو اس قدر ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے تکلیف دہ ذرے نظروں سے چھپ نہ سکیں اور فضائل ومناقب پر مشتمل بڑے سے بڑے پہاڑ بھی صاف دکھائی نہ دیں!

شبِ ہجرت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشورہ:

تذکرہ نگاروں نے بالاتفاق لکھا ہے کہ جب سرکار دو عالم ﷺ معراج سے واپس ہورہے تھے تو راستے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات فرمائی۔ انہوں نے پوچھ

لیا کہ آپ پر کتنے وقتوں کی نمازیں فرض قرار دی گئی ہیں؟ آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ پچاس وقتوں کی نماز فرض کی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ کی امت کم زور ہے اور پچاس اوقات کی ادائیگی ان پر دشوار ہوگی، لہٰذا واپس جایئے اور تخفیف کروایئے۔ اب اس واقعے کو مصنفہ کے اسلوب بیان میں سماعت کیجیے۔(۱)

"*Muhammad asks Moses for advice about how frequently Muslims should pray. Originallay, God wanted salat fifty times a day, but Moses kept sending Muhammad back to God until the number of prescribed prayers had been reduced to five.*"(۲)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے موسیٰ (علیہ السلام) سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا کہ مسلمان کتنے اوقات کی نماز آسانی کے ساتھ ادا کرسکیں گے؟ بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے ایک دن میں پچاس وقتوں کی نمازیں فرض قرار دی تھیں، جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بار بار انہیں بارگاہ الٰہی میں واپس بھیجنے پر کم ہوتے ہوتے پانچ اوقات کی ہوگئیں۔''

ٹھیک ہے کہ متذکرہ بالا عبارت کے دوسرے حصے سے ہمیں اختلاف نہ ہو، لیکن ابتدائی حصہ تو بہ ہر حال تاریخی حقائق وشواہد سے پوری طرح متصادم ہے۔ سیرت کی بنیادی کتابوں کے حوالے سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود فرضیت

۱- دیکھیے: سیرت حلبیہ، ج:۲، ص:۱۳۲، نیز سیرت ہشام، ج:۲، ص:۲۰۹

۲- زیر بحث کتاب، ص:۹۸

نماز کے حوالے سے سرکار دو عالم ﷺ سے استفسار کیا ہے، جب کہ کیرن آرمسٹرانگ کہتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشورہ فرمایا ہے، جو کہ تاریخی اعتبار سے قطعی درست نہیں۔

تاریخی حقیقت کو مسخ کرنے کے پس پردہ عوامل سے تو وہی بہ ہر واقف ہوں گی، لیکن جو بات بظاہر دکھائی دیتی ہے وہ یہی ہے کہ مصنفہ چوں کہ اہل کتاب سے ہیں، اس لیے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو مجیب کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے انہیں سرکار دو عالم ﷺ پر فضیلت دینا چاہتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مبعوث کیے گئے سارے انبیائے کرام ہمارے نزدیک قدر و منزلت رکھتے ہیں، لیکن ایک مصدقہ تاریخی حقیقت کی تکذیب کرتے ہوئے سرور کائنات ﷺ پر حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا تفوق ثابت کرنا علمی خیانت کے مترادف ہے۔

حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کی تصاویر:

کیرن آرمسٹرانگ نے فتح مکہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"Inside the kabah, the walls had been decorated with pictures of the pagan deities, and Muhammad ordered them all to be obliterated, though, it is said, he allowed frescoes of Jesus and Mary to remain." (۱)

"کعبہ مقدسہ کی اندرونی دیواریں قبائلی دیوتاؤں کی تصاویر سے آراستہ کی گئی تھیں، جنہیں محمد (ﷺ) نے مٹانے کا حکم دیا، تاہم کہا جاتا ہے کہ

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۲۰۰

حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تصاویر کو انہوں نے باقی رہنے دیا۔"

حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت و بزرگی سے انکار نہیں، لیکن یہ کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصاویر کو یوں ہی چھوڑ دیا، تاریخی حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ چوں کہ مصنفہ نے اپنی بات کسی حوالے کے بغیر کہی ہے، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟ دوسری جانب ہمیں ایسے شواہد و حقائق تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا اِمتیاز ساری تصاویر کو مٹوادیا تھا۔

اس حوالے سے سیرت حلبیہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سارے دیوتاؤں کی تصاویر کو مٹادیا، لیکن حضرت ابراہیم کی تصویر یوں ہی چھوڑ دی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا:

"یاعمر الم آمرك ان لا تترك فیها صورة؟"(۱)

"اے عمر! کیا میں نے تمہیں یہ حکم نہیں دیا تھا کہ کسی بھی تصویر کو نہ چھوڑنا؟"

سیرت ابن ہشام کی ایک دوسری روایت میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے کہ بلا اِمتیاز ساری تصاویر مٹادی گئیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ جملہ پڑھیے:

"ثم امر بتلك الصور كلها و طمست"(۲)

"پھر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری تصاویر کے حوالے سے حکم صادر فرمایا اور وہ سب مٹادی گئیں۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ تاریخی اعتبار سے کس قدر وضاحت کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی دیواروں پر بنی ہوئی فرضی تصویروں کو نہ صرف

۱- سیرۃ حلبیہ، ج:۳، ص:۳

۲- سیرت ابن ہشام، ج:۴، ص:۱۷۱

مٹانے کے احکامات صادر فرمائے، بلکہ وہ سب مٹا بھی دی گئیں۔

یہاں یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ انبیائے کرام کی فرضی تصاویر کے مٹانے کے لیے سیرت حلبیہ کی روایت کے مطابق سرکار دو عالم ﷺ نے زعفران طلب فرمایا اور اس کا عرق ان تصاویر پر پھیر دیا گیا۔ یعنی گو کہ وہ تصاویر محض فرضی خیالات پر مبنی تھیں، جن کا انبیائے عظام کے حقیقی خد و خال سے دور دور تک کوئی تعلق تھا ہی نہیں، لیکن چوں کہ ان کی نسبت کسی نہ کسی طرح انبیائے کرام سے ہو گئی تھی، اس لیے انہیں مٹایا بھی جا رہا ہے، تو بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ۔ اسے ہی دیوانے ''نسبت کی قدر و منزلت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ (۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گریہ وزاری:

کوئی شک نہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کی ظاہری حیات طیبہ کے آخری لمحات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں گزرے۔ کیرن آرمسٹرانگ اسی لمحے کی تصویر کشی کرتی ہوئے کہتی ہیں:

"Looking down, Aisha discovered that he had gone. Carefully she laid his head on the pillow and began to beat her breast, slap her face, and cry aloud in the traditional way."(۲)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بغور دیکھا اور یقین کر لیا کہ آپ ﷺ کی روح پرواز کر چکی ہے۔ انہوں نے ہوشیاری کے ساتھ سر مبارک ﷺ کو تکیہ پر رکھا، اور اپنا سینہ پیٹنے لگیں، اپنے چہرے پر مارنے لگیں اور مروّجہ

۱- دیکھیے، انوار احمدی، ص: ۴۲

۲- زیر بحث کتاب، ص: ۲۰۸

تہذیب کے مطابق زور سے رونا شروع کر دیا۔"

سرکار دو عالم ﷺ کی ظاہری وفات پر فطری اظہار غم و افسوس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اسلام فطرت سے ہم آہنگ مذہب ہے، وہ نہ فطری فرحت و شادمانی کی تردید کرتا ہے اور نہ ہی افسوس ناک واقعات پر فطری اظہار غم و حسرت سے روکتا ہے، لیکن کسی کی موت پر زمانہ جاہلیت کے مطابق بال نوچنے، گریبان چاک کرنے، سینہ پیٹنے اور چلا چلا کر رونے سے شریعت اسلامیہ بلاشبہ سختی کے ساتھ منع کرتی ہے۔ اس حوالے سے دو ارشادات نبوی سماعت کرتے چلیے۔

"لیس منا من لطم الخدود، شق الجیوب، و دعا بدعوی الجاھلیة"(۱)

"جو گال پیٹے، گریبان چاک کرے اور زمانہ جاہلیت کے طریقے پر روئے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے کسی کی موت پر جاہلی رسم و رواج کے مطابق نوحہ کرنے سے کس قدر سختی کے ساتھ نہ صرف روکا ہے، بلکہ یہ وضاحت بھی فرما دی ہے کہ ایسے لوگ ان کے طریقے پر نہیں ہیں۔ اتنے صریح الفاظ میں نوحہ گری سے روکے جانے کے باوجود کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سرکار دو عالم ﷺ کی موت پر وہ سب کچھ کیا ہوگا جس کی جانب مصنفہ نے اشارہ کیا ہے؟

مَیں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ کسی کی موت پر شدت غم و افسوس سے خود بہ خود پلکوں کا دامن تر ہو جائے اور چند قطرے چھلک پڑیں، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ انتقال فرما جاتے ہیں، تو آپ ﷺ نے انہیں اپنی گود رحمت میں

۱- بخاری، ج:۱، ص:۴۳۴

اٹھا لیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں اور آنسوؤں کے قطرے چھلک رہے ہیں۔ اتنے میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پوچھ لیتے ہیں کہ آقائے کائنات! آپ نے تو ہمیں رونے سے منع کیا تھا اور پھر آپ خود رو رہے ہیں؟ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فطری آنسو اور نوحہ گری کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتے ہوئے وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا:

''انی لم انه عن البکاء، انما نهیت عن النوح عن صوتین احمقین فاجرین......... صوت عند مصیبة، خمش وجوه شق جیوب ورنة الشیطان''(۱)

''میں نے رونے سے منع نہیں کیا ہے، بلکہ میں نے نوحہ کی دو فاجر اور لایعنی آوازوں سے روکا ہے.........دوسری دوران مصیبت بلند ہونے والی آواز، چہرے نوچنے، گریبان چاک کرنے، شیطان کی ایما پر چیخ و پکار سے...''

بڑی مصیبت یہ ہے کہ مصنفہ نے اپنی متذکرہ بالا رائے پر تاریخی اوراق سے کوئی حوالہ نقل نہیں کیا ہے، تاکہ ہم اس کی صداقت و حقانیت کا سراغ لگا سکتے۔ بہرکیف ہم یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اظہار افسوس کے حوالے سے ایک روایت امام بیہقی سے نقل کرتے ہیں۔ پہلے اسے پڑھ لیجیے!

''فاخذت وسادة فوسدتها رأسه، ووضعته من حجری، ثم قمت مع النساء ابکی، التدم''(۲)

''میں نے ایک تکیہ لیا اور اسے آپ کے سر مبارک کے نیچے رکھتے ہوئے،

۱- کنز العمال، ج:۱، ص:۳۱۸۲

۲- دلائل النبوۃ، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی گود سے اٹھا کر الگ کر دیا، پھر میں عورتوں کے ساتھ رونے لگی اور چہرے پر مارنے لگی۔''

اس روایت کی فنی حیثیت سے قطع نظر، زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روئیں اور اپنے چہرے پر ہاتھ مارا، تاہم اسے زمانۂ جاہلیت کے طریقہ ماتم کے ثبوت کے لیے ہرگز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور پہلے ہی یہ بات کہی جا چکی ہے کہ شدت غم و افسوس کی وجہ سے فطری طور پر کوئی حرکت ہو جائے، تو وہ قابل مؤاخذہ نہیں ہے۔

حقیقتِ نبوت کو سمجھنے والے صرف چند تھے:

بلاشبہ مرکز عقیدت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال امت اسلامیہ کے لیے نہایت ہی تکلیف دہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے وصال کی خبر سنی، تو عالم بے خودی میں یہاں تک کہہ گئے کہ مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پالنہار حقیقی کے پاس اسی طرح گئے ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دنوں کے لیے گئے تھے، اور وہ جلد ہی ہمارے درمیان واپس آ جائیں گے۔(۱)

ابن ماجہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایسے افسوس ناک لمحات میں خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

''واللّٰہ ما مات رسول اللّٰہ، و لا یموت حتی یقطع ایدیَ اناس من المنافقین ، کثیر و ارجلھم....''(۲)

''قسم ہے اللہ کی، رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال نہیں فرمایا ہے اور وہ اس وقت تک وصال نہیں کریں گے یہاں تک کہ منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں....''

۱- دیکھیے، سیرت حلبیہ، ج:۳، ص:۴۵۵

۲- ابن ماجہ، ج:۱، ص:۵۲۰

اتنی تمہید کے بعد مصنفہ کے قلم کا تیور ملاحظہ کیجیے:

"Muhammad had been as controversial in his dying as in his living. Very few of his followers had comprehended the full significance of his prophetic career."(۱)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی موت کے حوالے سے بھی اسی قدر متنازع شخصیت رہے جس طرح اپنی حیات کے حوالے سے۔ ان کے پیروکاروں میں سے صرف چند ہی ایسے تھے جو ان کے پیغمبرانہ مشن کو پوری طرح سمجھ سکے۔''

دیکھ رہے ہیں آپ! اپنے محبوب سے والہانہ عشق ومحبت، عقیدت والفت اور وارفتگی و بے خودی کے نتیجے میں زبان سے نکلے ہوئے کلمات کی کیسی بے ہودہ تعبیر کی جارہی ہے؟ دیکھنے والے رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ ابرو پر جان دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے والے دیوانوں کے تلاطم خیز جذبات کا سراغ کیوں نہیں لگاتے؟ وہ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ان کے مرکزِ عقیدت سرمایہ حیات بھی تھے اور جینے کی آرزو بھی۔ کاش عالم تصورات ہی میں دیکھ لیتے تو وصال یار کے موقع پر ایک دیوانے کی زبان سے ادا ہونے والے کلمات کے حقیقی مفہوم تک پہنچنے میں دشواری نہ ہوتی۔

خدارا انصاف سے بتائیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متذکرہ بالا کلمات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت وصال کے موقع پر متنازع رہی ہے؟ پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ متذکرہ بالا روایات کے اخیر میں یہ صراحت بھی

۳- زیر بحث کتاب، ص:۲۱۰

مذکور ہے کہ جیسے ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی تصدیق کردی تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے۔

اور پھر انہی کلمات کی بنیاد پر یہ تہمت کس قدر بڑی ہے کہ صرف چند صحابہ کرام نے ہی آپ کے پیغمبرانہ مشن کو پوری طرح سے سمجھا۔ کیا یہ بتانے کی زحمت کریں گی کہ جب صرف چند صحابہ نے ہی آپ کے پیغمبرانہ مشن کو پوری طرح سے سمجھا، تو پھر لاکھوں لاکھ سرفروشان اسلام کی مقدس جماعت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر جان دینے کے لیے تیار کیوں رہتی تھی؟ کیا یہ بات تسلیم کرنے کے لائق ہے کہ کوئی کسی کو سمجھے بغیر ہی اس کے کہے پر اپنی متاع حیات کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہو جائے؟ ذرا بارگاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرام کی نیازمندیوں کا جائزہ تو لے کر دیکھیں، فرط ادب سے نگاہیں نیچی ہیں .... آواز پست ہے .... جسم ساکت ہے ...... اور گردن جھکی ہوئی ہے۔ کیا یہ سب یوں ہی ہے؟ ضمیر پکار رہا ہے کہ "زبان و بیان کی جادوگری" دکھاوے کے لیے ہوسکتی ہے، لیکن "اذہان وقلوب" کی سجدہ ریزی دکھاوے کے لیے نہیں ہوسکتی، وہ جب بھی نمودار ہوگی، تو جلوہائے حقیقت ہی کی عکاسی کرے گی۔

XXX

معراج کی شب رویتِ باری تعالیٰ

کوئی شک نہیں کہ ہجرت سے پہلے سرکارِ دو عالم ﷺ کو معراج ہوئی ہے، جس کا اجمالی تذکرہ تو قرآن مقدس کے سورۂ اسریٰ اور سورہ النجم میں ہے، جب کہ اسے پوری تفصیلات کے ساتھ احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پیشِ نگاہ رہے کہ شبِ معراج رسول اکرم ﷺ کی رویت باری تعالیٰ کے حوالے سے ملت اسلامیہ میں قدرے اختلافات ہیں، جن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مصنفہ نے جو تکلیف دہ بات کی ہے، اسے انہیں کی زبان میں سماعت کیجیے!

" Later Muslims began to piece together these fragmentary references to create coherent narrative. Influenced perhaps by the stories told by Jewish mystics of their ascent through the seven heavens to the throne of God, they imagined their prophet making a similar spiritual flight."(۱)

''بعد میں مسلمانوں نے ان بکھرے ہوئے دلائل کو ترتیب دے کر ایک مضبوط رائے قائم کر لی۔ شاید یہ سب یہودیوں کی ان کہانیوں سے متاثر

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۹۵

ہونے کا نتیجہ ہے، جو وہ ساتوں آسمان سے گزرتے ہوئے عرش الٰہی تک پہنچنے کے حوالے سے بیان کرتے ہیں مسلمانوں نے بھی تصور کرلیا کہ ان کے نبی نے بھی اسی طرح کا روحانی سفر کیا ہے۔"

مصنفہ نے بات شروع کی تھی کہ علمائے اسلام کے درمیان سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کو سر کی آنکھ سے دیکھنے کے حوالے سے مختلف آراء ہیں، لیکن آگے بڑھتے بڑھتے وہ واقعہ معراج ہی کو سرے سے مشکوک بنا رہی ہیں۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار کھیلنے کی کوشش ہو رہی ہے، ایک یہ کہ حقیقت معراج کی نسبت یہودیوں کی غیر مصدقہ کہانیوں سے ہو جائے اور دوسری یہ کہ معراج مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو یکتائے روزگار معجزات کی فہرست سے باہر کر دیا جائے۔ میں بہت دیر تک تجسس کے زیر اثر آپ کو نہیں رکھنا چاہتا، اس لیے مناسب ہے کہ مصنفہ نے جن یہودی کہانیوں کی جانب اشارہ کیا ہے، ان کی حقیقت کے بارے میں قدرے اختصار کے ساتھ گفتگو ہو جائے۔

پُراسرار یہودی کہانیاں:

یہودی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق یہودی مذہب کی معتمد کتابوں میں اس طرح کی پُراسرار کہانیاں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کو دو طرح کے معراج ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ ہمیشہ کے لیے جنت لے جائے گئے ہیں تاکہ وہاں کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں، اور دوسرے یہ کہ کوئی وحی الٰہی لینے کے لیے خدا کے پاس جائے اور پھر واپس روئے زمین پر آجائے۔ پہلی قسم کے لیے **Enoch**، **Elijah**، ابراہیم کے محافظ **Ebed Melek**، سلیمان کے معبد بنانے والے **Jabez**، موسیٰ کی رضاعی والدہ، اور فرعون کی بیٹی وغیرہ کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں،

جب کہ دوسری قسم میں تورات لینے کے لیے بارگاہ خداوندی میں حضرت موسیٰ کی حاضری کی مثال شامل کی جاسکتی ہے۔(۱)

ذرا دیکھیے تو سہی کہ معراج مصطفیٰ ﷺ کے تانے بانے جن فرضی یہودی کہانیوں سے ملائے جارہے ہیں، ان میں خود ان کے عقیدے کے مطابق معراج سے مشرف ہونے والوں میں صرف انبیائے کرام شامل نہیں ہیں، بلکہ عام لوگ بھی ہیں۔ اسے تسلیم کرنے کے بعد ''معراج'' کی اہمیت، قدرومنزلت اور تقدس ماٰبی میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔ اسے یہودیوں کی من گھڑت کہانیوں سے منسوب کرنے کے بعد معراج النبی ﷺ کے فضائل ومناقب کے بارے میں مصنفہ دسیوں صفحات بھی لکھتی چلی جائیں، تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی کہ جب بنیاد ہی مشکوک بنادی جائے، تو کھڑی رہنے والی عمارت کیوں کر پائیدار اور مستحکم قرار دی جاسکتی ہے۔

غیر مغربی مصنفوں کے یہاں یہ بات عام ہے کہ وہ کہنے کو ''تحقیق وتدقیق''، ''تنقیح وتشریح'' اور ''تفکر وتدبر'' جیسے بڑے بڑے اور بھاری بھرکم الفاظ کے سائے میں اپنی تحریریں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، لیکن جب سراغ لگایئے تو محسوس ہوگا کہ ''سائے'' سے چھن کر آنے والی روشنی مصنوعی تھی۔

بات نکلی ہے تو معراج مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے مغربی دنیا کے ایک معتمد مصنف کی تحریر کا یہ اقتباس پڑھتے چلیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ذوق سماعت اسے سننے کی سکت نہیں رکھتی، لیکن تردید فکر ونظر کے لیے اسے بعینہٖ نقل کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ الفاظ وبیان میں تبدیلی کردیے جانے کے الزامات سے بچا جاسکے۔

"Alfred guillaume even raised a bold hypothesis that the night journey, briefly

---

۱- دیکھیے، **Jewish encyclopedia (online)**.

described in surah 17:1, actually represents an umra that Muhammad (Peace be upon him) allegedly performed from a place situated on the iraqi pilgrim road (in wadi ji'rana, at the boundary of the Meccan haram) and called al-masjid al-aqsa, to Mecca and back in one night."(۱)

"الفریڈ گیولیم نے ایک بے باک تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں جس معراج کا تذکرہ ہے، وہ دراصل ایک عمرہ کے بارے میں ہے، جو محمد (ﷺ) نے وادی جعرانہ (جو عراق سے آنے والے زائرین کے راستے میں ہے اور حرم مکہ سے قریب ہے) اور جسے مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے، سے ایک رات میں مکہ جانے اور واپس آنے کے لیے کیا ہے۔"

مجھے یقین ہے کہ متذکرہ بالا تحریر کے بے ہنگم خیالات کی تردید کرنا بھی کارعبث ہے، کہ جسے مشہور و معروف مسجد اقصیٰ وادیِ جعرانہ کے کہساروں میں نظر آ رہی ہو، اس کے اندھے پن کے لیے کسی دلیل کی حاجت ہی کیا ہے؟

ایک دوسرے مستشرق نے تو سرے سے معراج مصطفیٰ ﷺ ہی کی تکذیب کردی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی کج فہمی پر استدلال بھی قرآن کریم سے کرتے ہیں۔

"As peters observes, none of this is

۱- ***Ascent to Heaven in Islamic and Jewish Mysticism***، ص:۷

immediately apparent in the above-mentioned Qur'anic verse (17:1). instead; there are what appear to be (according to Qur'an 17:90-93) "earlier denials of the possibility of a heavenly journey with the revelation to Islam" (۱)

''پیٹر کے خیال میں سورت بنی اسرائیل کی متذکرہ بالا آیت میں معراج پر کوئی واضح دلیل نہیں ہے، بلکہ اسی سورت کی آیات ۹۰ سے ۹۳ تو صراحت کے ساتھ وحی کے لیے آسمانی سفر پر جانے کی تردید کرتی ہیں۔''

مستشرق جس آیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، بہتر ہے کہ اسے یہاں درج کر دیا جائے تاکہ موضوع بحث پوری طرح اجالے میں آجائے۔ اس آیت کریمہ کی شان نزول کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں کہ جب سرکار دو عالم ﷺ اہل مکہ کے درمیان پیغام اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے، تو ایک دن سرداران قریش کعبہ کے احاطے میں جمع ہوئے اور پہلے تو دعوت اسلامی کے ترک کرنے کے بدلے طرح طرح کی لالچ دیتے رہے، لیکن جب سرکار دو عالم ﷺ نے انہیں ٹھکرا دیا، تو کہنے لگے کہ اچھا پھر ان پہاڑوں کو ہٹا دیجیے، نہریں جاری کر دیجیے اور ہمارے مرے ہوئے باپ دادا کو زندہ کر دیجیے تاکہ ہم ان سے پوچھ سکیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ ہے یا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں، بلکہ جو پہنچانے کی ذمہ داری تھی وہ میں نے تم تک پہنچا دیا ہے۔ اتنے میں عبداللہ بن امیہ اٹھا اور کہنے لگا کہ خدا کی قسم میں کبھی آپ پر ایمان نہیں لاؤں گا جب تک تم سیڑھی لگا کر آسمان پر نہ چڑھو اور

۱۔ زیر بحث کتاب، ص: ۷

میری نظروں کے سامنے وہاں سے ایک کتاب اور فرشتوں کی ایک جماعت لے کر نہ آؤ، اور خدا کی قسم اگر یہ بھی کرو تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر بھی میں ایمان نہ لاؤں گا۔ اس واقعہ کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں سے خصوصیت کے ساتھ اسے پڑھیے۔(۱)

''اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ، وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتٰبًا نَّقْرَءُہٗ، قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا''(۲)

''یا آپ کے لیے سونے سے بنا کوئی گھر ہو، یا آپ آسمان کی بلندیوں پہ چڑھ جائیں، پھر آسمان پر چڑھ جانے کے باجود ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے لیے ایک کتاب نہ اتار لائیں، جسے ہم خود پڑھ سکیں، اے محبوب! آپ کہہ دیں کہ میرا پروردگار ان بے ہنگم مطالبات میں پڑنے سے پاک ہے اور میں تو ایک بشر ہوں جسے رسول بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔'' (فیضان القرآن)

یہ کہنے میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں اسلام کی عداوت کے نشے میں سرکار دو عالم ﷺ سے آسمان پر چڑھنے اور وہاں سے لوگوں کی نظروں کے سامنے ایک کتاب لانے، اور ساتھ ساتھ تصدیق کرتے ہوئے فرشتوں کے اتار لانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان بے ہنگم مطالبات کے پورا نہ کیے جانے کا اعلان ہو رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو آسمانی سفر کرانے پر قدرت نہیں رکھتا؟ یہاں تو نفی مطالبے کے نہ پورے کیے جانے کی ہے، قدرت الٰہی کی نہیں۔

۱- دیکھیے، خزائن العرفان، ص:۴۲۳

۲- القرآن الکریم، سورت: ۱۷، آیت: ۹۳

ذرا سوچیے کہ جو ذات برتر واعلیٰ ساری کائنات کی تخلیق کر سکتی ہے، وہ اپنے محبوب کو آسمانی سیر کرادے تو مقام حیرت و تعجب ہی کیا ہے؟ لیکن کیا کہیے کہ جب انسان تعصب ونفرت کے نشے میں مدہوش ہو جاتا ہے، تو اسے خود اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ کی محیر العقول کاریگری کے مظاہر دکھائی نہیں دیتے۔ بہ ہر کیف میں نے متذکرہ اقتباسات کو صرف اس لیے نقل کیا ہے تاکہ آپ کو نام نہاد مغربی تحقیقات کی چند جھلکیاں دکھا سکوں۔

اب آیئے ہم واپس اپنے موضوع کی جانب پلٹتے ہیں۔ مصنفہ کہتی ہیں کہ واقعہ معراج مصطفیٰ ﷺ یہودی کہانیوں کے زیر اثر مسلمانوں کے ذریعہ ترتیب شدہ ایک من گھڑت واقعہ ہے۔ بلاشبہہ واقعہ معراج مکی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور تاریخی اعتبار سے یہ بات قطعی ثابت نہیں کی جاسکتی کہ سرکار دو عالم ﷺ نے کبھی بھی کسی اہل کتاب سے ان کے مذہب کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کی ہوں، اس کے برعکس شواہد و قرائن اور دلائل و براہین ثابت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی اہل کتاب سے تفصیلی گفتگو مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد ہی ہوئی ہے۔ عدل وانصاف کی رفاقت میں فیصلے کیجیے کہ واقعہ معراج مکہ میں ظہور پذیر ہو رہا ہے اور مکہ میں اہل کتاب سے سابقہ بھی نہیں پڑا ہے، تو پھر یہ کہنا کس قدر زیادتی ہے کہ مسلمانوں نے یہودی کہانیوں سے متاثر ہو کر اپنے نبی ﷺ کے لیے معراج ثابت کرلی ہے۔

یہ تو رہی ایک پہلو سے متذکرہ مماثلت کی تردید، لیکن ذرا دوسرے پہلو سے بھی تو نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ وہ یوں کہ واقعہ معراج کے جزئیات نگاہوں کے سامنے رکھیے اور پھر یہودی کہانیوں کے مرکزی مفاہیم پر توجہ کیجیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ دونوں میں دور دور تک کوئی ربط ہے ہی نہیں۔ یہودیوں کے مطابق کسی کے مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے جنت میں چلے جانا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تورات لینے کے لیے کوہ طور پر

تشریف لے جانا، معراج مصطفےٰ ﷺ کے جزئیات سے کس طرح قریب ہو سکتا ہے؟

اِثباتِ رُویتِ باری تعالیٰ پر دلائل:

زیرِ بحث موضوع میں مصنفہ نے سرکار دو عالم ﷺ کی رویت باری تعالیٰ کے حوالے سے بھی ملت اسلامیہ کے درمیان ہونے والے اختلافات کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ یہ اختلافات تو ہیں، لیکن محققین علمائے کرام نے دلائل و براہین اور قابل قبول توجیہات کے آئینے میں رویت باری تعالیٰ کے اثبات کو ترجیح دی ہے۔ صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور علمائے کرام کے درمیان رویت باری تعالیٰ کے حوالے سے جو آراء ہیں انہیں ہم چھ ممکنہ اقسام کے تحت مندرج کر سکتے ہیں۔

۱۔مطلق رویت باری تعالیٰ کے اثبات کے قائلین

یہ گروہ بغیر کسی قید و بند کے مطلق رویت باری تعالیٰ کے اثبات کا قائل ہے۔ان میں امام احمد بن حنبل، شیخ ابن خزیمہ، شیخ آلوسی اور شیخ آجری رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ماتھے کی آنکھ سے رویت باری تعالیٰ کے قائلین

اس گروہ میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک، حضرت حسن بصری، حضرت عکرمہ، امام ابن جریر، امام ابوالحسن الاشعری، القاضی ابویعلی، شیخ ابوبکر النجاد، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ قاضی عیاض، امام النووی، امام ابن حجر عسقلانی، امام جلال الدین سیوطی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم شامل ہیں۔

۳۔دل سے رویت باری تعالیٰ کے قائلین

امام احمد اور امام قرطبی اپنے ایک قول میں، شیخ ابی المظفر السمعانی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ۔

۴۔ایک بار دل سے اور دوسری بار آنکھ سے رویت باری تعالیٰ کے قائلین

شیخ ابوالقاسم الاصفہانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔

۵۔رویت باری تعالیٰ کے بارے میں سکوت

شیخ دارمی، شیخ ابن عطیہ اور شیخ ابوحیان رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ۔

۶۔رویت باری تعالیٰ کے منکرین

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، شیخ ابوالعباس احمد بن عمر القرطبی، امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہم اپنے ایک قول میں۔

یہ ملت اسلامیہ کے درمیان پائے جانے والے اختلافات تھے، جنہیں سہولت کے لیے ایک ترتیب میں اجمالی طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ زیر بحث موضوع کے حوالے سے پوری تصویر نگاہوں کے سامنے رہے۔ اب آیئے اس کے مرکزی دائرے یعنی اثبات اور عدم اثبات کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔

رویت باری تعالیٰ کے قائلین کے دلائل:

ہم یہاں خالص فنی اور علمی موشگافیوں سے اجتناب کرتے ہوئے صرف چند معتمد صحابہ کرام اور علمائے عظام کے اقوال درج کرنے پر اکتفا کریں گے۔

"عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنھما ، قال: رای محمد ربہ"(۱)

"حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کو دیکھا۔"

"عن ابن عباس رضی اللہ عنھما ، قال: اتعجبون ان تکون الخلۃ لابراھیم، و الکلام لموسٰی، و الرویۃ لمحمد

۱۔ ترمذی، ج:۹، ص:۱۳۷

صلی اللہ علیہ وسلم''(۱)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے تھے کہ کیا تم لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ مقام خلت ابراہیم علیہ السلام کے لیے، شرف کلامی موسیٰ علیہ السلام کے لیے اور سعادت رویت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو۔''

امام زہری کہتے ہیں کہ بے شک سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج اپنے پروردگار کو دیکھا۔(۲)

شیخ عبدالرزاق شیخ معمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے کہتے تھے کہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ قسمیں کھاتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کا دیدار فرمایا ہے۔(۳)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ وہ کہتے تھے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کے دیدار سے مشرف ہوئے۔(۴)

رویت باری تعالیٰ کی نفی کرنے والوں کے دلائل:

یہاں بھی ہم اختصار کے ساتھ منکرین رویت باری تعالیٰ کے صرف چند اقوال کی جانب اشارہ کریں گے۔

اس گروہ میں سب سے نمایاں نام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔آپ سے شیخ مسروق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

''لقد تکلمت بشیء قف له شعری ، قلت : رویدا ، ثم

۱- نسائی، ج:۶، ص:۴۷۲

۲- دیکھیے، فتح الباری، ج:۸، ص:۴۷۴

۳- دیکھیے، عمدۃ القاری، ج:۱۹، ص:۱۹۸

۴- دیکھیے، کتاب التوحید لابن خزیمہ، باب ذکر الاخبار الماثورۃ

قرأت 'لقد رای من ایات ربه الکبری' فقالت: این تذهب بلك، انما هو جبرئیل من اخبرك ان محمد رای ربه ......فقد اعظم الفریة....''(۱)

''تم نے ایسی بات کی ہے جسے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میں نے عرض کیا کہ ذرا ٹھہریئے، پھر میں نے قرآن کی آیت پڑھی کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی بڑی نشانیاں دیکھیں، انہوں نے فرمایا کہ تم کس سمت جا رہے ہو؟ اس سے تو جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں، جو تم سے یہ کہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کا دیدار کیا ہے........ تو اس نے بہت بڑا بہتان باندھا۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بھی مذکورہ بالا آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا جن کے چھ سو پر تھے۔(۲)

مختلف اقوال کے درمیان ترجیح:

دونوں اقسام کے دلائل آپ نے ملاحظہ کر لیے ہیں۔ میں نے زیر بحث گفتگو کے شروع میں ہی کہا تھا کہ رویت باری تعالیٰ کے قائلین کی رائے علمائے محققین کے نزدیک راجح ہے۔ ترجیح کے اسباب یوں تو بہت ہو سکتے ہیں، لیکن میرے خیال میں انہیں دو وجوہات میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

پہلی وجہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی شخصیت صحابہ کرام کے نزدیک بڑی ہی محترم اور معتمد تھی۔ ان سے اجلہ صحابہ کرام مسائل پوچھتے تھے اور ان کی رائے کو

۱۔ ترمذی، ج:۹، ص:۱۳۶

۲۔ بخاری، ج:۳، ص:۱۱۸۰

اہمیت دیتے تھے۔ چوں کہ انہوں نے صراحت کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کے دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونے کی تصدیق کی ہے، لہٰذا یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اتنی بڑی بات وہ محض اپنے گمان سے کہہ سکتے ہیں، بلکہ یہ ہو نہ ہو آپ نے خود سرکار دوعالم ﷺ سے ضرور سنا ہوگا، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکوہ بالا حدیث سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے آیت قرآنیہ سے اِستدلال کرتے ہوئے رویت باری تعالیٰ کے اثبات کی تردید کی ہے، نہ کہ سرے سے واقعہ رویت کی۔(۱)

دوسری وجہ: منطقی طور پر یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کسی امر کے نفی پر قول اثبات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انکار کر رہی ہیں، تو بہت ممکن ہے کہ انہوں نے اسے سنا نہ ہو۔ اور آپ کی لاعلمی سے اثبات واقعہ کی تردید لازم نہیں آتی، جب کہ دوسری جانب کسی امر کے اثبات سے ظہور واقعہ کی تصدیق ضرور ہو جاتی ہے۔ اس لیے رویت باری تعالیٰ کے قائلین کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔(۲)

×××

۱- دیکھیے: شرح مسلم للنووی، ج:۳،ص:۵

۲- دیکھیے، التوحید لابن خزیمہ، ج:۲، ص:۵۵۶

میدانِ جنگ

کوئی شبہہ نہیں کہ کیرن آرمسٹرانگ نے سب سے زیادہ عدل و انصاف کے ساتھ جس موضوع پر گفتگو کی ہے، وہ میدان جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ دورانِ مطالعہ ایک نہیں، کئی ایک مقامات پر ایسے اقتباسات نگاہ سے گزرے، جنہیں جرات و بہادری اور حق وصداقت کے بہترین مرقعات کے خانے میں جگہ دی جاسکتی ہے۔

دورانِ جنگ انسانیت سوز حرکتوں سے باز رہنے کی اسلامی تعلیمات کے حوالے سے مصنفہ کہتی ہیں:

"Even in war, Muslims would abjure the savage customs of the past."(۱)

''جنگ میں بھی مسلمان ماضی کے ہول ناک رسم و رواج سے دور رہے۔''

اسی طرح ''جہاد'' کے حقیقی مفہوم سے روشناس کراتے ہوئے کہتی ہیں:

"His life was a Jihad; as we shall see, this word does not mean 'holy war', it means 'struggle."(۱)

۱۔ زیر بحث کتاب، ص:۱۳۶

۱۔ زیر بحث کتاب، بیک ٹائٹل

”آپ (ﷺ) کی حیات ایک جہاد تھی، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، جہاد کے معنی 'مقدس جنگ' کے نہیں ہیں، بلکہ اس کا معنی 'جدوجہد' ہے۔“

غزوہ بنو قریظہ:

اسی طرح بنو قریظہ کو دی جانے والی سزا کے حوالے سے عام مستشرقین کے اتہامات کی تردید کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"It is, however, important to note that the Qurayzah were not killed on religious or racial grounds. None of the other Jewish tribes in the oasis either objected or attempted to intervene, clearly regarding it as a purely political and tribal matter."(۱)

”یہ بات نہایت ہی اہم ہے کہ بنو قریظہ مذہب یا عصبیت کی بنیاد پر قتل نہیں کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے براعظم میں رہنے والے یہودی قبائل نے نہ تو مخالفت کی اور نہ ہی دخل اندازی کی کوئی کوشش، اس لیے کہ یہ واقعہ محض سیاسی اور قبائلی معاملہ تھا۔“

بات نکلی ہے تو اختصار کے ساتھ ہی سہی، بنو قریظہ کو دی جانے والی سزا کے پس منظر کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ تاریخ اسلامی شاہد ہے کہ جب سرکار دو عالم ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، تو وہاں اوس وخزرج نامی عرب قبائل کے علاوہ یہودی قبائل بھی آباد تھے۔ پیغام حق کے آگے سبھوں نے سر تسلیم خم کر دیا، لیکن یہودی

۲- زیر بحث کتاب، ص: ۱۶۲

قبائل مسلسل انکار کرتے رہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امن وسلامتی کے ساتھ رہنے کے مقاصد سے ان کے ساتھ معاہدہ امن کیا، جو "میثاق مدینہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق مدینہ میں رہنے والے قبائل پر لازم تھا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف بیرونی طاقتوں کی پشت پناہی نہ کریں۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اگر گھر ہی میں گھر کی تباہی و بربادی کے لیے سازشیں رچنے والے موجود ہوں، تو پھر اہل خانہ کے شب وروز اطمینان وسکون کے ساتھ نہیں گزر سکتے۔ بہ ہر کیف، یہودیوں نے کئی بار معاہدہ امن کی خلاف ورزی کی۔ وہ اسلام کو نقصان پہنچانے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے، جن کی تفصیلات تاریخ وسیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔(۱)

شدت اختصار کے پیش نظر ہم یہاں صرف بعض نکات کی جانب اشارہ کررہے ہیں، تاکہ مصنفہ کی متذکرہ بالا عبارت پوری طرح حقائق ومعلومات کے اجالے میں آجائے۔

۱- بنو نضیر نے ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر چکی کا پاٹ گرا کر معاذ اللہ انہیں شہید کرنے کا بھی منصوبہ بنایا تھا، تاہم وحی الٰہی کی ہدایت پر اسے ناکام بنادیا گیا۔

۲- تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جنگ خندق یہودیوں ہی کی سازشوں کا نتیجہ تھی۔ چوبیس یہودی عمائدین پر مشتمل ایک وفد مکہ گیا اور اس نے قریش کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ پر برانگیختہ کیا، نیز انہیں یقین دلایا کہ وہ جنگ میں ان کے ساتھ ساتھ ہوں گے یہاں تک کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام حق کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دیں۔ اس کے بعد وفد نے اطراف وجوانب کے

۱- دیکھیے، سیرت ابن ہشام، ج:۳، ص:۳۸۷

دیگر قبائل عرب سے بھی ملاقات کی۔ اس وفد میں کنانہ بن ربیع، حی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق، سلام بن مشکم ، ابو عمارہ اور ہوذہ بن قیس وغیرہ شامل تھے، جو قبائل یہود کی نمائندگی کر رہے تھے۔ (۱)

۳- قریش، بنی غطفان، بنی اسد، بنی مرہ، اشجع اور بنی نزارہ کے قبائل کے چالیس ہزار افراد پر مشتمل لشکر جرار مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے مدینہ منورہ کے اطراف میں کھودی گئی خندق کی وجہ سے وہ شہر میں داخل نہیں ہو سکے اور باہر ہی خیمہ زن رہے۔ جب بہت دنوں تک انہیں مدینہ منورہ پر حملہ کرنے میں ناکامی ہوئی تو کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر اندر سے بنو قریظہ مسلمانوں پر ہلہ بول دیں، تو ان کے پائے ثبات متزلزل ہو جائیں گے اور ہمیں آسانی کے ساتھ اپنے مقصد میں کامیابی مل جائے گی۔ چناں چہ حی بن اخطب نے انہیں یقین دلایا کہ وہ بنو قریظہ کو جنگ میں شرکت پر آمادہ کرلیں۔ اس طرح بنو قریظہ نے حی بن اخطب کے کہنے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے کیے ہوئے معاہدہ امن کو توڑ دیا اور جنگ میں حملہ آوروں کی نصرت وحمایت کا اعلان کر دیا۔ (۲)

۴- بنو قریظہ نے ایک رات یہ ارادہ کیا کہ مدینہ طیبہ پر رات کی تاریکی میں حملہ کر دیں۔ جیسے ہی مسلمانوں تک یہ خبر پہنچی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوری طور پر سلمہ بن اسلم الشہلی کی قیادت میں دو سو مجاہدین اور زید بن حارثہ کی قیادت میں تین سو مجاہدین کو مدینہ طیبہ کے تحفظ کے لیے روانہ کیا۔ یہ لوگ مدینہ طیبہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے زوردار نعرے لگاتے۔ چناں چہ جب بنو قریظہ کے

۱- دیکھیے، سیرت ابن ہشام، ج:۳، ص:۲۱۶

۲- دیکھیے، سیرت ابن ہشام، ج:۳، ص:۲۲۲

یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ مسلمان غفلت میں نہیں ہیں، تو انہیں حملے کی ہمت نہ ہو سکی۔(۱)

۵- دورانِ جنگ تحفظ و سلامتی کے پیشِ نگاہ خواتین اور بچے مدینہ منورہ کے ایک قلعہ میں ٹھہرا دیے گئے تھے۔ بنو قریظہ کے یہودیوں نے پانچ پانچ دس دس افراد کی ٹولیوں میں قلعہ کے گرد چکر لگانا شروع کر دیا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ موقع پاتے ہی خواتین پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ چناں چہ ایسے ہی ایک موقع پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ایک یہودی کو مشکوک حالت میں دیکھا اور قلعہ کی نگرانی پر متعین حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ جائیں اور اسے قتل کر دیں۔ انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ کام ان سے نہیں ہو سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پھر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا خود نیچے اتریں اور ایک بڑے شہتیر سے اس پر حملہ کر دیا۔ بعد میں یہودیوں کو مرعوب کرنے کے لیے انہوں نے مقتول کا سر تن سے جدا کر کے اسے یہودیوں کے قلعہ کی طرف پھینک دیا۔ یہ حکمت عملی بڑی کام یاب رہی اور یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ خواتین کے قلعہ کی نگرانی بڑے ہی منظم ڈھنگ سے کی جا رہی ہے۔ چناں چہ وہ حملہ کرنے کی جرات نہ کر سکے۔(۲)

یہودیوں کی پے در پے معاندانہ حرکتوں کی وجہ سے جنگ خندق کے بعد حکم الٰہی کے مطابق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے ساتھ بنو قریظہ کی سرکوبی کے لیے نکل پڑے۔ بہت دنوں تک قلعہ کا محاصرہ جاری رہا، بالآخر جب یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے، تو مناسب کارروائی کے لیے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا گیا۔ انہوں نے فیصلہ صادر کیا کہ ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتیں باندی بنا لی

۱- دیکھیے، ضیاء النبی، ج:۴، ص:۳۶

۲- دیکھیے، سیرت ابن ہشام، ج:۳، ص:۴۳۲

جائیں اور ان کے سامان مہاجرین و انصار میں تقسیم کر دیے جائیں۔

یہودیوں کے خلاف سخت کاروائی کے جواز کے حوالے سے کیرن آرمسٹرانگ کی یہ عبارت پڑھیے:

"These three Jewish tribes were clearly a security risk."(۱)

''یہ تینوں یہودی قبائل مدینہ منورہ کے تحفظ کے لیے ایک مسئلہ بن گئے تھے۔''

غزوۂ قینقاع:

بنو قینقاع نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے کیے ہوئے معاہدۂ امن و سلامتی کو منسوخ کر دیا۔ آپ ﷺ تک جب یہ بات پہنچی تو معاملات سلجھانے کے لیے خود ان کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں دل نشیں انداز میں نصیحت فرمائی۔ جواب میں انہوں نے نہایت ہی سخت دلی کے ساتھ مسلمانوں کو للکارتے ہوئے کہا کہ تم لوگ میدان جنگ میں عرب قوم سے مقابلہ کرتے ہوئے جیت گئے تھے، جنہیں فن حرب پر کوئی مہارت نہیں ہے، لیکن جب ہم سے مقابلے کرو گے، تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔(۲)

اسی دوران ایک مسلمان عورت کے ساتھ نازیبا واقعہ ہوگیا۔ ہوا یہ کہ کسی دن ایک مسلمان عورت بنو قینقاع کے بازار میں اپنا سامان تجارت فروخت کرنے کے بعد ایک زرگر کی دکان میں بیٹھی تھی۔ دکان دار نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح عورت کے چہرے سے نقاب ہٹوا دے، لیکن جب باتوں سے کامیابی نہیں ملی، تو ایک بد بخت یہودی نے ہوشیاری کے ساتھ خاتون کی قمیص کے پشت سے اپنی تہ بند کا ایک کونہ

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۴۰
۲- دیکھیے، روض الانف، ج: ۳، ص: ۳۱۲

باندھ دیا۔ اب ہوا یہ کہ جب خاتون اٹھنے لگیں، تو وہ بے حجاب ہوگئیں۔ اس شرارت پر خاتون نے مدد کے لیے آواز دی۔ پکار سن کر ایک غیور مسلمان بھاگتا ہوا آیا اور اس نے یہودی کا کام تمام کردیا۔ ردعمل کے نتیجے میں یہودیوں نے مل کر اس مسلمان نوجوان کو شہید کردیا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کی غیرت وحمیت کو للکاردیا اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثاروں کے ساتھ بنوقینقاع کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ پندرہ دنوں کے محاصرے کے بعد ان کی ہوا نکل گئی اور وہ مصالحت پر آمادہ ہوئے۔ انہوں نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ انہیں اپنے اہل خانہ کے ساتھ شہر سے نکل جانے کی اجازت دے دیں اور اسلحہ کے انبار بے شک وہ رکھ لیں۔ رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ تجویز منظور فرمائی اور انہیں تین دنوں کے اندر شہر سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔

اتنی تمہید کے بعد کیرن آرمسٹرانگ کی یہ عبارت پڑھیے:

"Bloodshed was avoided, but Muhammad was caught in a tragic moral dilemma: the justification for the jihad against the Quraysh had been the Muslims' exclusion from their native city, which was condemned by the Quran as a great evil. Now, trapped in the aggressive conventions of Arabia, he was compelled to eject another people from their homeland."(۱)

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۳۲

”قتل وخون ٹل گیا، لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک غیر اخلاقی اقدام کی زد میں آگئے، وہ یہ کہ مسلمانوں کو ان کے اپنے آبائی شہر سے نکالے جانے کو قریش کے خلاف جہاد کے لیے جواز قرار دیا جاتا ہے، جسے قرآن مقدس نے ایک بڑی برائی سے تعبیر کیا ہے۔ اب وہ خود ہی ایک قوم کو ان کے آبائی وطن سے نکال کر عرب کے مروجہ سخت اقدامات پر عمل کرنے کی زد میں آگئے۔“

ابھی آپ نے دیکھا کہ قبیلہ قینقاع کے افراد کیوں شہر بدر کیے جا رہے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہے کہ سرسری نگاہ سے ایک بار ان عوامل وعناصر کا جائزہ بھی لے لیں، جو مسلمانوں کے شہر مکہ چھوڑنے کا سبب بنے، تا کہ دونوں کے درمیان غیر جانب داری کے ساتھ موازنہ کیا جا سکے۔

تاریخ اسلامی گواہ ہے کہ اللہ کے نبی رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں پیغام حق کی تبلیغ شروع کی اور لوگوں نے مصائب وآلام کی دیواریں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ستاتے، ان کی راہ میں کانٹے ڈالتے، دوران نماز گردن مبارک پر جانور کی اوجھڑی ڈالتے اور انہیں قتل کرنے کی سازشیں تک رچتے، نیز ایمان قبول کرنے والوں کو بھی طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی پوری جد وجہد کرتے، بلکہ ایک بار تو ان لوگوں نے مسلمانوں کی معاشی ناکہ بندی بھی کر دی تھی۔ چلتے پھرتے مسلمانوں کا مذاق اڑانا، جملے کسنا اور انہیں پریشان کرنا تو جیسے ان کے معمولات میں شامل تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں مسلمانوں کو اپنی جائے پیدائش چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔

اسی ملک بدری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قرآن مقدس کہتا ہے:

”وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ، وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ

الْقَتْلِ ''(۱)

''...اور حرم کے مکینوں کو شہر بدر کر دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے، اس لیے کہ فتنہ انگیزی قتل وخون سے بھی زیادہ سخت تر ہے۔''

(فیضان القرآن)

دونوں شہر بدریوں کے ممکنہ عوامل وعناصر آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ از راہِ کرم عدل وِ انصاف کی رفاقت میں ان کے درمیان موازنہ کریں اور اپنے ضمیر کی آواز سننے کے لیے گوش برآواز رہیں۔

۱- بنو قینقاع سے معاہدۂ امن کے ذریعہ انہیں اپنے مذہب کے مطابق آزادی کے ساتھ جینے کا حق دیا جارہا ہے، جب کہ مکہ کے شر پسند عناصر تو مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ عبادت بھی نہیں کرنے دیتے۔

۲- بنو قینقاع مسلمانوں کو لڑائی کے لیے للکار رہے ہیں، جب کہ ہجرت سے پہلے مسلمانوں نے کبھی بھی اہل مکہ کو لڑنے کے لیے آواز نہیں دی۔

۳- بنو قینقاع کے ایک فرد نے مسلمان عورت کی عزت وناموس پر حملہ کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے، جب کہ مکہ میں کسی مسلمان نے وہاں کے باشندوں کی خواتین کے ساتھ ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔

۴- تاریخی شہادت کے مطابق بنو قینقاع نے خود ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے شہر مدینہ سے چلے جانے کی درخواست کی تھی، جب کہ اہل مکہ نے مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کر کے انہیں مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

۵- بنو قینقاع معاہدہ امن توڑنے کے بعد کسی بھی لمحے شہر کی سلامتی کے لیے خطرہ بن سکتے تھے، جب کہ مکہ کے مسلمان کبھی بھی شہر کے لیے خطرہ نہیں بنے۔

۱- القرآن الکریم، سورت: ۲، آیت: ۲۱۷

۶- بنو قینقاع کی شہر بدری ان کے کرتوتوں کی پاداش میں بہ طور سزا ہو رہی ہے، جب کہ مکہ سے مسلمانوں کو ان کے شہر سے بغیر کسی جرم کے نکالا جا رہا ہے۔

مَیں نہیں سمجھتا کہ اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی ہے، کہ حقانیت وصداقت آفتابِ نیم روز کی طرح اجالے میں ہے۔ متذکرہ بالا دونوں واقعات بظاہر دیکھنے میں ایک جیسے لگتے ہیں، لیکن جب ان کے ظہور پذیر ہونے کے اسباب وعلل کا سراغ لگایا جائے، تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی طرح کے ہوتے ہوئے بھی آپس میں بڑے ہی مختلف ہیں۔ اس لیے دونوں کے تانے بانے جوڑنے کی ناکام کوششوں کے ذریعہ مصطفےٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو کٹہرے میں کھڑا کرنا کسی طور مناسب نہیں۔

×××

اِزدواجی حالات

دوسرے مغربی مصنفین کی طرح کیرن آرمسٹرانگ کی تحریر میں بھی سرکارِ دو عالم ﷺ کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے گاہے بگاہے پرانے گھسے پٹے خیالات کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کے واقعی وجوہات تو شاید مصنفہ ہی بہتر بتا سکیں، تاہم اس کے دو اسباب مجھے واضح دکھائی دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ مصنفہ نے بھی اپنے پیش رو مغربی مفکرین کی نام نہاد تحقیق کو ہی حرف آخر سمجھ لیا ہے اور اصل مصادر و مراجع دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دانستہ طور پر ایک غیر مستند اور خلاف واقعہ بات کو کہتے رہنا چاہتی ہیں، اس امید پر کہ شاید کبھی نہ کبھی اسے حقیقت تسلیم کر ہی لیا جائے۔

بہرکیف یہاں ذیلی عنوانات کے تحت بعض موضوعات پر گفتگو کی جائے گی۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح:

ویسے تو مستشرقین عام طور پر نبی اکرم ﷺ کی شادیوں کے حوالے سے زبانِ طعن دراز کرتے ہی رہتے ہیں، لیکن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح ان کے نشانے پر سب سے زیادہ رہتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضرت زینب بنت جحش کی شادی پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہو چکی تھی، جو کہ شرعی ممانعت سے پہلے سرکار دو عالم ﷺ کے منہ بولے بیٹے کہلاتے تھے۔ اسلام نے

جب منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کی رسم ختم کر دی، تو حضرت زید رضی اللہ عنہ پھر سے اپنے باپ کی طرف نسبت کرتے ہوئے پکارے جانے لگے۔ زمانہ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کی بیوہ حقیقی بہو تصور کی جاتی تھیں، جن سے نکاح کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسلام نے نہ صرف منہ بولے بیٹے کی رسم ختم کر دی، بلکہ اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی بے کنی بھی کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا مطلقہ ہو گئیں، تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم الٰہی کی اطاعت کرتے ہوئے ان سے شادی کر لی۔ قرآن کریم کی یہ آیت ملاحظہ کیجیے!

"فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا" (۱)

"لہٰذا جب زید نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، تو ہم نے عدت کے بعد وہ خاتون تمہارے نکاح میں دے دی تاکہ مؤمنین کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ ہو، جب کہ وہ انہیں طلاق دے چکے ہوں۔"

اس واضح تصریح کے بعد یہ کہنے میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے پس پردہ جو بنیادی مقصد تھا، وہ یہی کہ ایک غلط رسم کی بیخ کنی کے بعد، اس کے نتیجے میں مروجہ تہذیب وتمدن کی تردید بھی عملی طور پر کر دی جائے۔

اتنی تمہید کے بعد اب ذرا متذکرہ نکاح کے حوالے سے کیرن آرمسٹرانگ کی تحریر پڑھیے۔ مجھے یقین ہے کہ خوش عقیدہ مسلمانوں کے لیے اسے پڑھنا نہایت ہی دشوار

۱۔ قرآن کریم، سورت: ۳۳، آیت: ۳۷

ہوگا، لیکن کیا کیجیے کہ پرکشش مغربی غلاف کے پیچھے چھپے ہوئے غلیظ افکار وخیالات کی تردید کے لیے اسے نقل کرنا بھی ضروری ہے۔ بہ ہر کیف دل پر جبر کر کے کسی طرح اسے پڑھ ہی لیجیے۔

"Muhammad (Peace be upon him) seems to have seen her with new eyes to have fallen in love quite suddenly when he had called at her house one afternoon to speak to Zayd, who happened to be out. Not expecting any visitors, Zaynab had come to the door in dishabille, more revealingly dressed than usual, and Muhammad had averted his eyes hastily, mutturing ' Praise be to Allah, who changes men's Hearts'."(۱)

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) انہیں ایک نئی نظر سے دیکھتے ہی اس وقت گرفتارِ محبت ہو گئے، جب کہ آپ ﷺ کو زید سے گفتگو کرنے کے لیے دوپہر کے وقت ان کے گھر بلایا گیا تھا اور زید گھر پر موجود نہ تھے۔ چوں کہ زینب کسی آنے والے کی توقع نہیں رکھتی تھیں، اس لیے وہ غیر مہذب اور عام حالات سے زیادہ پرکشش لباس پہنے ہوئے دروازے پر آ گئیں۔ ایسے موقع پر محمد (ﷺ) اپنی نظریں پھیرتے ہوئے بے ساختہ کہہ پڑے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو مردوں کے دلوں کو پھیر

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۶۷

دیتا ہے......"

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، کیسی بے ہودہ حکایت گھڑ لی گئی ہے! سوچتا ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ جس واقعے کو ایک عام شریف انسان سے منسوب کرنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے، اسے اشرف الشرفا کی ذات گرامی سے منسوب کرتے ہوئے ذرا بھی جھجک نہیں محسوس ہو رہی ہے؟ قارئین دیکھ لیں کہ یہ وہی کتاب ہے جسے نہ صرف غیروں کے یہاں مستند سمجھا جاتا ہے، بلکہ اپنے بھی اسے غیر جانب دار، متوازن اور حقیقت پسند تحریروں کی صف میں شامل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نگاہ رہے کہ صرف کیرن آرمسٹرانگ ہی اسے تحریر کرنے والی نہیں ہیں، بلکہ ولیم میور نے بھی اپنی کتاب "محمد اینڈ اسلام" میں اسے بعض کلمات کی تبدیلی کے ساتھ نقل کیا ہے۔ بہر کیف آیئے اب ہم متذکرہ واقعہ کی حیثیت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیرن آرمسٹرانگ کی نقل کردہ حکایت پر غور کریں تو کئی طرح کے تناقضات سامنے کھڑے دکھائی دیتے ہیں:

۱- رحمت کائنات سرکار دو عالم ﷺ کو حضرت زید رضی اللہ عنہ سے گفتگو کے لیے بلایا بھی جا رہا ہے، اور وہ خود گھر سے غائب بھی ہیں، کیا یہ بات منطقی اعتبار سے درست کہی جاسکتی ہے؟

۲- بلاشبہ حضرت زید رضی اللہ عنہ خانہ نبوت کے پروردہ ہیں اور ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ گفتگو کرنے کے لیے بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہونے کی بجائے سرکار دو عالم ﷺ کو اپنے یہاں بلوائیں گے۔

۳- ایک طرف تو مصنفہ کہتی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے تشریف لانے کی درخواست کی جا رہی ہے، اور دوسری جانب وہ کہتی ہیں کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو دوپہر کے

وقت کسی کے آنے کی توقع نہیں تھی۔

۴- کوئی شک نہیں کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا آپ کی پھوپھی زاد بہن ہیں اور آپ نے انہیں بارہا دیکھا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جسے شادی سے پہلے بارہا دیکھتے رہے ہوں، لیکن اس کے حسن و جمال سے متاثر نہ ہوئے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے شادی ہوتے ہی وہ بھلی لگنے لگیں۔

۵- تاریخی صفحات گواہ ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے توسط سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا ہے۔ اگر واقعی زیر بحث واقعہ میں کسی قسم کی کوئی صداقت ہوتی، تو انہیں چاہنے والا کسی دوسرے سے ان کے نکاح کے لیے کوشش نہیں کرتا۔

۶- یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے رشتہ نکاح کا پیغام بھیجا، تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی نے پہلے یہ سمجھا کہ یہ پیغام خود آپ نے اپنے لیے بھیجا ہے، اور بہ صد مسرت وخوشی اسے قبول کرلیا۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ یہ پیغام حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے ہے، تو دونوں کے لیے اسے قبول کرنا دشوار ہوا، اتنے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی؛

”وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ“(۱)

”جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا حکم فرمادیں تو نہ کسی مومن مرد کو اور نہ ہی کسی مومن عورت کو اپنے معاملے میں کسی قسم کا کوئی اختیار رہے۔“

(فیضان القرآن)

۷- کہا جاتا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی عمر شریف اس وقت ۳۵ یا ۳۷ سال رہی

۱- القرآن الکریم، سورت:۳۳، آیت:۳۶

ہوگی، جو کہ عرب تہذیب وتمدن کے پیش نظر کوئی قابل پر کشش عمر نہیں کہلاتی۔ قابل غور یہ ہے کہ جسے ایک شخص عین شباب میں دیکھ کر فریفتہ نہ ہو، اسے ڈھلتی عمر میں دیکھ کر متاثر ہو جائے، کیا یہ بات عقل تسلیم کرتی ہے؟

۸- ترمذی شریف کی حدیث میں صراحت ہے کہ جب حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ کیا، تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلاق دینے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ تم اسے روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو۔ کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ اگر یہ واقعہ درست ہوتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں طلاق دینے سے منع کیوں کرتے؟(۱)

۹- متذکرہ بالا حکایت مجھے حدیث کی کسی معتمد کتاب میں نظر نہیں آئی، جب کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح اور دعوت ولیمہ کا تذکرہ کئی جگہوں پر ملتا ہے۔ جو صحابہ کرام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب حیات کا ایک ایک ورق سلامت رکھنے کے لیے پوری جد وجہد کرتے رہے، ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس واقعے کی طرف اشارہ تک نہ کریں۔

۹- زیر بحث واقعہ ہمیں صرف تفسیر اور سیرت کی دو چار کتابوں میں ملتا ہے، جیسے روح البیان، تفسیر شیخ ابن عطیہ، سیرت ابن اسحاق، سیرت حلبیہ وغیرہ۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تفسیر اور سیرت ایسے فنون ہیں جہاں نہ روایات کی تفتیش ہوتی ہے اور نہ ہی راویوں کی چھان بین، لہٰذا ایسے بے بنیاد واقعات کی ایسی کوئی علمی حیثیت نہیں کہ جس کے سہارے اتنے بڑے الزام کی تعمیر کی جاسکے۔

۱۰- اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نگاہ رہے کہ معتمد مفسرین، کبار محققین اور ذمہ دار علمائے کرام نے متذکرہ واقعہ کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے۔ جیسے امام ابو بکر ابن عربی،

۱- دیکھیے، ترمذی، ج:۶، ص:۶۳

شیخ ابن قیم جوزیہ اور امام قرطبی وغیرہم نے بہت تفصیل کے ساتھ اس پر گفتگو کی ہے اور اسے منصب نبوت ﷺ کے منافی اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔(۱)

اپنوں کی بات نکل گئی ہے تو کہیں یہ خیال نہ آجائے کہ جب بعض مسلمان مفسرین اور سیرت نگاروں نے بھی زیر بحث واقعے کو نقل کیا ہے، تو پھر کیرن آرمسٹرانگ پر اس قدر برسنے کی ضرورت کیا ہے؟ جواب کے لیے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ کسی مسلمان کے قلم سے ایک بے بنیاد واقعہ صفحہ قرطاس پر آجائے، تو کیا اسے دوسروں کے لیے سند جواز قرار دے دیا جائے گا؟ سن لیا جائے کہ دور حاضر کے مستشرقین تو تحقیق وجستجو کے نام پر ''مسلمات'' اور ''معتقدات'' تک کو نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خلاف واقعہ حقیقت کو دو چار مسلمانوں کے ذریعہ لکھے جانے پر بغیر کسی تحقیق وتفتیش کے بڑے چاؤ سے مزے لے لے کر بیان کر دیا جائے اور عدل وانصاف کے خون کا کوئی دھبہ بھی اپنے دامن میں لگنے نہ دیا جائے۔

اچھا یہ تو رہی ایک بات، اب اگر آپ واقعی یہ جاننے کے خواہش مند ہیں کہ کیرن آرمسٹرانگ میرے نشانے پر کیوں ہیں، تو زہر میں ڈوبی ہوئی یہ عبارت پڑھیے، جسے انہوں نے اسی واقعہ کے حوالے سے لکھا ہے:

"This story has shocked some of Muhammad's Western critics who are used to more ascetic, Christian heroes, but the Muslim sources seem to find nothing untoward in this demonstration of their

---

۱- دیکھیے: زاد المعاد، ج:۴، ص:۲۴؛ زوجات النبی الطاہرات، ص:۶۴؛ تفسیر قرطبی، ج:۱۴، ص:۱۸۸

Prophet's virility."(1)

"اس واقعے نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مغربی نقادوں کو حیرت زدہ کر دیا ہے، جو کہ عیسائی عمائدین کو بڑے زاہد سمجھتے تھے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ مسلمان ذرائع اپنے پیغمبر کے اس غیر اخلاقی مظاہرے پر کوئی بے عزتی محسوس نہیں کرتے۔"

چلیے تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ متذکرہ بالا واقعہ کے نقل کرنے کے حوالے سے مصنفہ کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، لیکن کیا اس بات سے بھی انکار کر دیجیے گا کہ یہ عبارت ان کی اپنی نہیں ہے؟ لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ ایک نہیں دو دو غلطیاں تسلیم کریں۔ پہلی یہ کہ انہوں نے ایک بے بنیاد واقعہ کو بغیر کسی تحقیق کے اپنی کتاب میں جگہ دی اور دوسری یہ کہ انہوں نے سارے مسلمانوں پر یہ الزام بھی لگا دیا کہ انہوں نے متذکرہ حکایت کو بہ سر و چشم قبول بھی کر لیا ہے۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایک غیر جانب دار سیرت نگار کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ کسی بھی معاملے کے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کرے۔ صرف منفی رائے کا ذکر کرنا اور مثبت رائے سے چشم پوشی کرنا بلاشبہ قابل مؤاخذہ حرکت ہے۔

واقعہ افک:

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ وہ جب سفر پر نکلتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے اور جس کا نام نکل جاتا اسے ہم رکابی کا شرف میسر آتا۔ غزوۂ مصطلق جاتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نام قرعہ میں نکلا، لہٰذا آپ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ چوں کہ پردے کا حکم نازل ہو چکا تھا، لہٰذا آپ کے لیے

۱۔ زیر بحث کتاب، ص: ۱۶۸۔ ۱۶۷

ایک ہودج ساتھ رہتا، جب قافلہ روانہ ہونے لگتا تو لوگ اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے اور جب کہیں پڑاؤ ہوتا تو اسے زمین پر رکھ دیا جاتا۔ جہاد سے واپسی پر معمول کے مطابق قافلے نے پڑاؤ کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے ہودج سے نکل کر قضائے حاجت کے لیے گئیں۔ واپس ہوئیں تو دیکھا کہ گلے میں ہار موجود نہیں ہے۔ بڑی تشویش ہوئی اور آپ اسے ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑیں۔ انہیں ہار تو مل گیا، لیکن آپ کی واپسی تک قافلہ جا چکا تھا۔ وہ لوگ جو ہودج اٹھانے اور رکھنے پر مامور تھے، انہیں آپ کی غیر موجودگی کا احساس تک نہ ہوا اور انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اسے اونٹ پر رکھ دیا۔ صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ قافلے کے کوچ کرنے کے بعد علاقے کا جائزہ لیتے اور کسی کی کوئی چیز انہیں پڑی ہوئی ملتی تو اسے اس کے مالک تک پہنچا دیتے۔ انہوں نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا، تو معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئے اور اپنا اونٹ آگے بڑھا دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس پر سوار ہو گئیں اور چلتے ہوئے قافلہ سے آملیں۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے انہیں دیکھ لیا اور بے بنیاد افواہ پھیلا دی۔

اتنی تمہید کے بعد اب ذرا کیرن آرمسٹرانگ کے متعصب قلم سے نکلے ہوئے چند جملے سماعت کیجیے:

"She sat down to wait and sure enough, her old friend Safwan ibn al-Muattal, who had fallen behind the others, turned up and put her on the back of his own camel. When Aisha rejoined the expedition with Safwan, the old rumor about their illicit relationship

started up again, and Muhammad's enemies gleefully imagined the worst."(1)

''وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگیں اور مطمئن تھیں، کہ اتنے میں اپنے پرانے دوست صفوان بن معطل کو آتے ہوئے دیکھا، جو دوسروں سے بچھڑ گئے تھے۔ انہوں نے آپ کو اپنے اونٹ پر سوار کروایا۔ جب حضرت عائشہ صفوان کے ساتھ قافلے سے جاملیں، تو ان کے درمیان ناجائز تعلقات پر مبنی پرانی افواہ پھر سے گردش کرنے لگی اور دشمنانِ رسالت مآب تو بڑی مسرتوں کے ساتھ خراب ترین حالات کا تصور کرنے لگے۔''

یہاں تک تو یہ بات تاریخی اعتبار سے درست ہے کہ منافقین کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے نتیجے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاکیزگی وطہارت داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی تھی، جس کی وحی الٰہی نے واضح تردید کردی، لیکن مصنفہ کے لگائے گئے دو الزامات پر غور کیجیے، وہ کہتی ہیں ''اپنے پرانے دوست'' اور ''ناجائز تعلقات پر مبنی پرانی افواہ''۔ معاذ اللہ من ذالک۔ کیرن خود بھی تصدیق کررہی ہیں کہ یہ افواہ تھی، لیکن پھر بھی اس طرح کے سخیف وسفیہ جملے لکھنے سے اپنے بہکے ہوئے قلم کو نہ بچاسکیں، اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ مصنفہ نے اپنے اس دعوے پر نہ تو کوئی دلیل پیش کی ہے، اور نہ ہی کوئی حوالہ بیان کیا ہے۔ اور وہ اپنے بے بنیاد اتہامات کے لیے دلائل وبراہین لائیں گی بھی کہاں سے؟

خیال رہے کہ اسے بے خیالی میں لکھے ہوئے سہو سے بھی تعبیر نہیں کیا جاسکتا، کہ انہوں نے ایک دوسرے مقام پر بھی یہی الزام لگایا ہے۔ ذرا پڑھ لیجیے:

"There was a good deal of spiteful gossip

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۷۳

about Aisha and a young man called Safwan ibn al-Muattal."(۱)

"حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) اور نوجوان صفوان بن معطل (رضی اللہ عنہ) کے تعلقات کے حوالے سے اچھی خاصی مشکوک افواہ گردش کر رہی تھی۔"

اب یقین آیا کہ مصنفہ نے غلط فہمی کی بنیاد پر "پرانے تعلقات" کی ترکیب استعمال نہیں کی ہے، بلکہ یہ دین اسلام سے محض عناد و تعصب کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور پھر ذرا شاطر ذہن کی عیاری ملاحظہ فرمائیے کہ مصنفہ نے سب کچھ کہنے کے بعد وہ آیت کریمہ بھی نقل کی ہے، جس کے ذریعہ اللہ رب العزت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا اعلان فرمایا ہے۔ ٹھیک ہے متذکرہ آیت سے اس بے بنیاد افواہ کی تردید ہوگئی جو کچھ دنوں تک مدینہ کی فضاؤں میں گردش کرتی رہی، لیکن جو الزامات مصنفہ نے لگائے ہیں، وہ تو جوں کے توں باقی رہے۔ آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ واقعہ افک کے حوالے سے مصنفہ کی تحریر پڑھنے کے بعد ایک اجنبی قاری کا ذہن پوری طرح صاف ہونا مشکل نظر آتا ہے، بلکہ کہنے دیا جائے کہ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے معیوب رائے کے قریب پہنچ سکتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مصنفہ اپنے من گھڑت اِتہامات کے ذریعہ یہی چاہتی بھی ہیں کہ افواہوں کی گود میں پلنے والے اتہامات کے اثرات وحی الٰہی کے تیز دھارے میں پوری طرح بہنے نہ پائیں۔

عجیب وغریب اِتہامات:

کیرن آرمسٹرانگ کے مزید بے بنیاد اِتہامات کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو اِسے پڑھیے!

۱- زیرِ بحث کتاب، ص: ۱۶۶

"It was whispered that Muhammad was now too old to satisfy his wives or that he had a testicular hernia."(۱)

''یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی تھی کہ محمد (ﷺ) کی عمر اس قدر ہو گئی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو مطمئن نہیں کر سکتے، یا یہ کہ انہیں خصیاوی ہرنیا ہو گیا ہے۔''

معاذ اللہ، کیسی کیسی بے ہودہ باتیں ہیں، کہ جنہیں پڑھتے ہی طبیعت مکدر ہوئی جارہی ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ مصنفہ نے متذکرہ بالا مفروضہ کی بنیاد کے لیے جو اشارے دیے ہیں وہ قرآن کریم کی دو آیات ہیں۔ آپ بھی انہیں پڑھ لیجیے:

''تُرْجِیْ مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَ تُئْوِیْ اِلَیْكَ مَنْ تَشَاءُ، وَ مَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ، ذٰلِكَ اَدْنٰی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَ لَا یَحْزَنَّ وَ یَرْضَیْنَ بِمَا اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ، وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ، وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا''(۲)

''اے محبوب! آپ ان میں سے جس کی باری چاہیں مؤخر کر دیں اور جسے چاہیں اپنے قریب کرلیں، اور جسے آپ نے خود سے دور کر دیا ہے اسے دوبارہ شرف قربت عطا کریں جب بھی آپ پر کوئی مضائقہ نہیں، اس ہدایت سے توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور وہ آزردہ خاطر نہیں رہیں گی، نیز وہ سب کی سب اس پر راضی رہیں گی جو آپ انہیں عطا فرمائیں گے، اللہ خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا بھی ہے اور حلیم و بردبار بھی۔''

۱- زیر بحث کتاب، ص: ۱۲۶

۲- القرآن الکریم، سورت: ۳۳، آیت: ۵۱

"یَسْئَلُکَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ، قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ، وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَکُوْنُ قَرِیْبًا" (۱)

"لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہیے کہ اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، اے پوچھنے والے! تجھے کیا معلوم شاید کہ وہ قریب ہی آ چکی ہو۔"

زحمت نہ ہو تو متذکرہ بالا آیات قرآنیہ کو دو چار مرتبہ مزید پڑھ لیجیے اور مصنفہ کی رائے اور دلائل کے درمیان کسی بھی طرح کی کوئی یگانگت ڈھونڈنے کی کوشش کیجیے۔ تھک ہار کر بیٹھ جائیں، تو اپنے ضمیر کے احساسات کو پیکر تعبیر میں ڈھالیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہی پرانی مثل حرف بہ حرف تعبیر کے پردے میں صاف دکھائی دے گی کہ "مارو گھٹنا پھوٹے سر"۔ اندازہ لگائیں کہ یہی وہ کتاب ہے، جسے غیر تو خیر سے غیر ہی، اپنے بھی اپنی ہی آواز سمجھتے ہیں! ؎ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

سننے کی سکت ہے تو سنیے کہ قصور صرف کیرن آرمسٹرانگ ہی کا نہیں ہے، بلکہ ہمارا بھی ہے۔ ان کا، اس لیے کہ انہوں نے بے سروپا باتوں کی بنیاد پر اپنے تخیلات کی پرکشش عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے، اور ہمارا، اس لیے کہ ہم نے مغربی مرعوبیت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اسے اپنا لیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں دور جدید کی گود میں پروان چڑھنے والا ایک ایسا طبقہ بھی ہے، جسے اپنے اسلاف اور محققین کی تحریریں بے وزن دکھائی دیتی ہیں، جب کہ مغربی مصنفین کی بہ نام "تحقیق و تدقیق" شائع ہونے والی متعصبانہ تحریریں بڑی ہی وقیع و ثقیل محسوس ہوتی ہیں۔

فکر و نظر کا عجیب و غریب تضاد ہے کہ لوگ دنیاوی پس منظر میں تو گھر کی باتیں گھر والوں سے سننا پسند بھی کرتے ہیں اور انہیں اعتماد کی نگاہ سے دیکھتے بھی ہیں،

۱- القرآن الکریم، سورت: ۳۳، آیت: ۶۳

جب کہ دینی اعتبار سے اپنی باتیں سننے کے لیے اپنوں کو غیروں پر ترجیح نہیں دیتے اور نہ ہی انہیں تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

XXX

مصادر و مراجع

۱- بخاری شریف: امام محمد بن اسمٰعیل بخاری، دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۴

۲- مسلم شریف: امام مسلم بن الحجاج، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۲

۳- ترمذی: امام محمد عیسی ترمذی، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۴

۴- مسند احمد: امام احمد بن حنبل، مکتبہ دار الاقصیٰ کویت، ۱۹۸۵

۵- مصنف ابن ابی شیبہ: امام عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ، دار الفکر

۶- مجمع الزوائد: شیخ علی بن ابی بکر ہیثمی، دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۰

۷- الاکمال فی ذکر من لہ روایۃ فی مسند احمد: شیخ محمد بن علی الحسینی، دار الفکر العربی، ۱۹۹۲

۸- فتح الباری: امام احمد بن علی ابن حجر عسقلانی، دار الفکر، ۱۹۹۳

۹- طبقات کبری: شیخ محمد بن سعد، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۷

۱۰- عمدۃ القاری: حافظ بدر الدین محمود بن احمد عینی، دار الفکر

۱۱- نزہۃ القاری: فقیہ العصر شیخ شریف الحق امجدی، دائرۃ البرکات، ۱۹۸۴

۱۲- السیرۃ النبویہ: شیخ احمد زینی دحلان مکی، دار لقلم حلب، سوریا، ۱۹۹۶

۱۳- سیرت سرور عالم: سید ابو الاعلی مودودی، ادارہ ترجمان قرآن، لاہور، ۱۹۸۹

۱۴- تفسیر خازن: شیخ علاء الدین خازن، دار الکتب العربیہ

۱۵- التفسیر الکبیر: امام فخر الدین رازی، دار احیاء التراث العربی

۱۶- روح المعانی: شیخ محمود بن عبداللہ آلوسی، دار الفکر

۱۷- ترجمہ بخاری: مولانا عبدالحکیم خان، فرید بکڈپو، دہلی

۱۸- سیرت ابن ہشام: شیخ عبدالملک بن ہشام، دار المعرفہ

١٩- سیرۃ نبویہ: شیخ ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر، ١٩٧٦ء

٢٠- الروض الانف: شیخ عبدالرحمٰن بن عبداللہ السہیلی، دار الکتب العلمیہ، ١٩٩٩ء

٢١- نظرۃ جدیدۃ فی سیرۃ رسول اللہ: کونستانس جورجیو، مترجم پروفیسر محمد التونجی

٢٢- تفسیر نسفی: شیخ عبداللہ بن احمد النسفی۔ دار النفائس، ١٩٩٦ء

٢٣- مسند بزار: شیخ احمد بن عمرو بن عبدالخالق البزاز، مکتبۃ العلوم والحکم، ٢٠٠٣ء

٢٤- شفا شریف: الشیخ قاضی عیاض بن موسیٰ، دار الکتب العلمیہ، ١٩٩٨ء

٢٥- المعجم الکبیر: الشیخ سلیمان بن احمد الطبرانی، موسسۃ الرسالہ

٢٦- التحریر والتنویر: شیخ محمد الطاہر بن عاشور، دار سحون، تیونس، ١٩٩٧ء

٢٧- جلالین: شیخ جلال الدین سیوطی، دار الکتب العلمیہ

٢٨- کشاف: شیخ محمود بن عمر الزمخشری، دار الفکر

٢٩- مستدرک: شیخ محمد بن عبداللہ الحاکم، دار الکتب العلمیہ، ١٩٩٠ء

٣٠- لباب التاویل فی معنی التنزیل: شیخ ابوالحسن علی بن محمد خازن

٣١- انوار احمدی: شیخ انوار اللہ حیدر آبادی، مکتبہ جام نور، دہلی، ١٩٩٨ء

٣٢- کنز العمال: شیخ علی المتقی الھندی، دار الکتب العلمیہ

٣٣- دلائل النبوۃ: شیخ احمد بن الحسین بن علی البیہقی، دار الفکر

٣٤- سیرت النبی: جسٹس امیر علی

٣٥- الجوہرۃ فی نسب الرسول: شیخ عز الدین

٣٦- الوفا بتعریف المصطفےٰ: شیخ عبدالرحمٰن بن جوزی، دار الکتب العلمیہ، ١٩٩٥ء

٣٧- خزائن العرفان: صدر الافاضل شیخ نعیم الدین، فرید بکڈپو

٣٨- تفسیر قرطبی: شیخ محمد بن احمد القرطبی، دار الکتب العلمیہ

٣٩- تفہیم القرآن: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، لاہور

٤٠- سنن بیہقی: شیخ احمد بن الحسین بن علی البیہقی، دار الفکر

٤١- ضیاء النبی: شیخ پیر کرم شاہ ازہری، المجمع المصباحی، ٢٠٠٠ء

٤٢- سیرت حلبیہ: شیخ عبداللہ بن سنان الخفاجی، دار المعرفہ

۴۳- تفسیر طبری: شیخ محمد بن جریر الطبری، دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۳
۴۴- تفسیر ابن کثیر: شیخ اسماعیل بن عمر بن کثیر، مکتبۃ المعارف م بیروت، ۱۹۹۵
۴۵- سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرت خیر العباد: شیخ محمد بن یوسف الصالحی الشامی، لجنۃ احیاء التراث الاسلامی، قاہرہ، ۱۹۹۷
۴۶- رہنمائے حیات: مولانا وحید الدین خان، گڈورڈ بک، دہلی، ۲۰۰۲
۴۷- سنن ابن ماجہ: امام محمد بن یزید الربعی، دار احیاء التراث العربی
۴۸- سنن نسائی: امام احمد بن علی النسائی، دار الفکر، ۱۹۹۶
۴۹- کتاب التوحید: امام ابوبکر محمد بن اسحٰق بن خزیمہ، ملتقی اہل الحدیث، نٹ بک
۵۰- شرح مسلم: امام یحیٰی بن شرف النووی، دار الفکر، ۱۹۹۴
۵۱- زاد المعاد: شیخ محمد بن ابی بکر الجوزیہ، دار المعرفہ
۵۲- زوجات النبی الطاہرات: قاضی ابوبکر ابن عربی
۵۳- جیوش انسائیکلوپیڈیا، نٹ بک
۵۴- ایسنڈ توبیون ان اسلامک اینڈ جیوش: الکس استاون، نٹ بک

×××

دُنیائے اِسلام کے حوالے سے پچاس مسائل پر
بے لاگ تبصرہ و تجزیہ

فکر و نظر کے دریچے

تجزیہ نگار

ڈاکٹر مولانا غلام زرقانی

دار الاسلام

لاہور - پاکستان

"فکر و نظر کے دریچے" کے بعد ایک اور فکر پارہ

نقشِ خیال کی پرچھائیاں

کالم نگار

ڈاکٹر مولانا غلام زرقانی

دیباچہ

محمّد نواز کھرل

دار الاسلام، لاہور

تفسیر ام القرآن

از

رئیس القلم علامہ ارشد القادری

مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی

انوار الاسلام

فہرست کتب

والضحیٰ پبلی کیشنز

دکان نمبر 9، مرکز الاولیس، ستا ہوٹل، دربار مارکیٹ، لاہور

0300-7259263 0315-4959263

	امام احمد رضا ایک مظلوم مفکر	علامہ عبدالستار ہمدانی برکاتی مدظلہ	260/-
	امام احمد رضا خان ایک ہمہ جہت شخصیت	مقالہ: کوثر نیازی	30/-
	پیغمبر انسانیت	مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی مدظلہ	220/-
	بارہ ماہ کی عبادات	علامہ شہزاد ترابی قادری صاحب	200/-
	فقہ حنفی سے دیوبندیوں کا ارتداد	مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی	120/-
	فقہ حنفی میں حالات زمانہ کی رعایت	مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی	130/-
	عید الاضحیٰ کا تحفہ	علامہ محمد صادق عطاری المدنی صاحب	200/-
	جرنیلِ اہلِ سنت	سجاد حیدر قادری	480/-
	شمشیرِ اعلیٰ حضرت	محمد بلال رضا قادری	400/-
	جواہر البیان فی اسرار الارکان	علامہ مفتی نقی علی خان نوری رحمۃ اللہ علیہ	220/-
	اسلام اور عیسائیت (ایک تقابلی مطالعہ)	مفتی جاوید احمد عنبر مصباحی	200/-
	میلاد مصطفیٰ (قرآن وحدیث کی روشنی میں)	مرتب: میثم عباس قادری رضوی	380/-
	نماز باروی	قاری امتیاز حسین باروی	70/-
	ترک رفع یدین	نقاد العصر فیصل خان رضوی	180/-
	الملفوظات پر اعتراضات کے جوابات	مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی	500/-
	طریقہ جدیدہ (اول، دوم، سوم)	السید محمد امین المصری (سیٹ)	260/-
	ریاض الصالحین (عربی)	الامام ابی زکریا یحییٰ بن اشرف النووی	520/-
	تاریخ الخلفاء	علامہ جلال الدین سیوطی	400/-
	کشف الصدور بجواب شفاء الصدور	نقاد العصر فیصل خان رضوی	260/-

مطلع القمرین فی ابانة سبقة العمرین افضلیتِ ابوبکر و عمر (تخریج وتحشیہ)	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان مفتی محمد ہاشم خان العطاری المدنی	260/-
احکامِ تعویذات مع تعویذات کا ثبوت	مفتی محمد ہاشم خان العطاری المدنی	200/-
احکام عمامہ مع سبز عمامہ کا ثبوت	مفتی محمد ہاشم خان العطاری المدنی	200/-
میلاد النبی و معمولات و نظریات	مفتی محمد ہاشم خان العطاری المدنی	300/-
محرم الحرام و عقائد و نظریات	مفتی محمد ہاشم خان العطاری المدنی	240/-
خطبات محرم	مفتی جلال الدین احمد امجدی	350/-
رسائلِ محرم	محدث دہلوی، امجدی، بریلوی	300/-
احکامِ تراویح و اعتکاف	مفتی محمد ہاشم خان العطاری المدنی	220/-
تحفہ شادی خانہ آبادی	علامہ محمد فیض سلطان قادری عطاری	280/-
زلف و زنجیر مع لالہ زار	علامہ مفتی محمد ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ	240/-
عجائب القرآن مع غرائب القرآن	علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی	240/-
نور شریعت	علامہ ابو المحامد حافظ نور محمد قادری رضوی	200/-
مسئلہ افضلیت اور اکابرِ امت ایک تحقیق ایک تجزیہ	نقاد العصر فیصل خان رضوی مدظلہ	360/-
مفتی اعظم ہند کی نعتیہ شاعری	ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی	320/-
مناقب سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ	علامہ مفتی شفقات احمد نقشبندی مجددی	240/-
اقوال و افکار نقشبند	محمد صادق قصوری	200/-
سیرت الصدیق	نواب حبیب الرحمان خان شروانی	200/-
فقہ اسلامی کے سات بنیادی اصول	مولانا مفتی نظام الدین رضوی	300/-
تذکرہ خاندان نبوت	ابوتراب علامہ ناصر الدین ناصر مدنی	320/-
آیئے قرآن سمجھیں	ابوتراب علامہ ناصر الدین ناصر مدنی	220/-
بے مثل رسول ﷺ کے بے مثل واقعات	علامہ محمد شہزاد قادری ترابی مدظلہ	170/-
تذکرہ علمائے امرتسر	محقق عصر حکیم محمد موسیٰ امرت سری صاحب	240/-



شمشیر اعلیٰ حضرت
جواہر البیان
اسرار الارکان
امام احمد رضا ایک مظلوم مفکر
بارہ ماہ کی عبادات
تاریخ عرس بزرگان دین
جرنیلِ اہلسنت
فقہ حنفی
حالات زمانہ کی رعایت
فقہ حنفی
سے دیوبندیوں کا ارتداد
پیغمبر انسانیت
خزائن التعریفات
تعریفات علوم درسیہ
کنز التعریفات
خاندان نبوت
نور شریعت
تحفہ شادی خانہ آبادی
اسلام اور عیسائیت